(۳)......جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اپنا دین مکمل کیا، اسی طرح آپ ﷺ پر اعلیٰ اَخلاق بھی مکمل فرما دیے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ ﴿إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ یہ حقیقت ہے کہ آپ خلق عظیم پر قائم و فائز ہیں۔ رسول اللہ ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں: ((إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ)) یعنی ''میری بعثت کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ میں مکارمِ (عالی شان) اخلاق کی تکمیل کروں۔''

(۴)......آپؐ خاتم النبیین ہیں: چناں چہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک شخص نے انتہائی خوب صورت عمارت بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اُس عمارت کو دیکھنے آتے ہیں تو (اُس کی خوب صورتی) کی تعریف کے ساتھ ساتھ ایک اینٹ کی جگہ خالی دیکھ کر) حیران ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ کی جگہ بھی پر کیوں نہ کی گئی؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔'' [صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین] [ماخوذ از ''محبۃ الرسولؐ بین الاتباع والابتداع'' تالیف: عبدالرؤوف محمد عثمان]

# وقت!

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ زندگی کو موت سے قبل غنیمت جانو۔

[مستدرك حاكم]

جب کہ ایک جگہ فرمایا کہ اکثر لوگ صحت اور فراغت وفرصت کی قدر نہیں کرتے انھیں ضائع کر دیتے ہیں۔

بعض حکماء نے وقت کی اہمیت وقدر بتانے کے لیے اسے برف سے تشبیہ دی ہے کہ یہ برف کی طرح پگھلتا جا رہا ہے۔وقت تین طرح کا ہے۔ماضی،حال،مستقبل

① ...... ماضی: گزرا ہوا وقت تو ہاتھ نہیں آ سکتا، اس پر افسوس کرتے چلے جانا مزید وقت کا ضیاع ہے۔

② ...... مستقبل: آئندہ وقت کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے، اُس کے لیے منصوبے بنائے جاسکتے ہیں مگر اُسے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

③ ...... حال: لمحۂ موجودہ یعنی موجودہ وقت (زمانۂ حال) ہی بس قابل استعمال ہے، اگر انسان اسے بچالے۔ جو لوگ لمحۂ موجود کو ضائع ہونے سے بچا لیتے ہیں اُن کا ماضی تابناک ہوتا چلا جاتا ہے، اور وہ اپنے مستقبل کو بھی درخشاں بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

[مستفاد از ''شاہراہِ زندگی پر کامیابی کا سفر'' تالیف: محمد بشیر جمعہ]

# فہرست

| قُلْ | اِنِّیْ (اِنَّ + یْ) | اُمِرْتُ | اَنْ | اَعْبُدَ | اللّٰہَ | مُخْلِصًا | لَّہُ (لَ + ہٗ) | الدِّیْنَ ⑪ | وَ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| کہہ دو | بیشک میں | میں حکم دیا گیا ہوں | کہ | میں عبادت کروں | اللّٰہ | خالص کرنے والا | واسطے+اُسکے | دین | اور |

| اُمِرْتُ | لِاَنْ (لِ + اَنْ) | اَکُوْنَ | اَوَّلَ | الْمُسْلِمِیْنَ ⑫ | قُلْ | اِنِّیْ (اِنَّ + یْ) | اَخَافُ | اِنْ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| میں حکم دیا گیا ہوں | واسطے+کہ/تا کہ | میں ہو جاؤں | پہلا | فرمانبرداری کرنے والا | کہہ دو | بیشک+میں | میں ڈرتا ہوں | اگر |

| عَصَیْتُ | رَبِّیْ (رَبِّ+یْ) | عَذَابَ | یَوْمٍ | عَظِیْمٍ ⑬ |
|---|---|---|---|---|
| میں نے نافرمانی کی | پروردگار+میرا | عذاب | دن | بڑا |

''(اے پیغمبر ﷺ)! کہہ دو درحقیقت مجھے حکم (ہی یہ) ملا ہے کہ میں اللّٰہ کی بندگی کروں اُس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے ⑪۔اور مجھے یہ حکم (بھی) ملا ہے کہ فرماں برداروں (مسلمانوں) میں سے پہلا ہو جاؤں ⑫۔تم کہہ دو یہ حقیقت ہے کہ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے ⑬۔'' [الزمر: ١١ تا ١٣]

## قیامت کے قریب دھوکا اور فریب عام ہوگا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

《 سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ سَنَوَاتٌ خَدَّاعَاتٌ يُصَدَّقُ فِيهَا الْكَاذِبُ، وَيُكَذَّبُ فِيهَا الصَّادِقُ، وَيُؤْتَمَنُ فِيهَا الْخَائِنُ، وَيُخَوَّنُ فِيهَا الْأَمِينُ 》 [ابن ماجه: ٤٠٣٦]

''عنقریب لوگوں پر ایسا وقت آئے گا جس میں ہر طرف دھوکا ہی دھوکا ہوگا، جھوٹے کو سچا اور سچے کو جھوٹا سمجھا جائے گا اور خائن کو امانت دار اور امانت دار کو خائن سمجھا جائے گا۔''

## فکر وغم، عاجزی وکاہلی اور قرض وغیرہ سے پناہ مانگنے کی دعا

انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللّٰہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے:

《 اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ 》

[بخاری: ٦٣٦٩]

''اے اللّٰہ! میں فکر، غم، عاجزی، کاہلی، بزدلی، بخیلی، قرض کے بوجھ اور لوگوں کے تسلط سے تیری پناہ پکڑتا ہوں۔''

# ''قومی'' مفاد

**اداریــــــــہ** ═══ حافظ احمد شاکر

خوش فہم ملت اسلامیہ اور زود اعتبار قوم پاکستانیوں کے خوش آئند اور بہتر مستقبل کی امیدوں کے مرکز جناب اوبامہ، جو سکہ رائج الوقت میں امریکہ کی صدرات کے عہدے پر فائز ہیں، اب کچھ کچھ کھلنے لگے ہیں۔ ہمارے یعنی پاکستان کے متعلق ان کا یہ اعلان کہ ''مستقبل کی امریکی حکمت عملی کے تحت جنوب ایشیا میں افغانستان اور پاکستان دونوں ہی ''یکساں اہمیت'' کے حامل ہیں'' ان کے خیالات کا عکس اور سوچوں کا مظہر ہے۔ چوں کہ امریکا کو...... نام نہاد...... دہشت گردی کے خلاف جنگ کا معرکہ افغانستان میں درپیش ہے اور افغانستان و پاکستان پر امریکی اداروں کی عراق جیسی ''حق سچ'' رپورٹ کی بنیاد پر وہ دنیا کو یہ باور کراتا ہے کہ اس جنگ کو کنٹرول پاکستان کے شمالی علاقہ جات سے کیا جاتا ہے اس لیے اس نے دونوں کی ''یکساں اہمیت'' کے حامل ہونے کا عندیہ دیا ہے۔ ہمارے خیال میں جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ امریکا اگر افغانستان میں پٹ گیا تو غصہ پاکستان پر نکالے گا اور اگر...... اس کے فرض کردہ...... طالبان پٹ گئے تو وہ بھی اپنا غصہ پاکستان کے عوام پر ہی نکالیں گے کہ طالبان گمان کرتے ہیں کہ امریکا کو بنیادی سہولتیں پاکستان ہی دے رہا ہے۔ اب افسوس ناک حیرت یہ ہے کہ پاکستان کے صدر مملکت دونوں مما لک کو یکساں اہمیت کا حامل قرار دینے کی امریکی پالیسی کی بڑی خوشدلانہ تائید بھی کرتے ہیں اور امریکا کو اس پالیسی پر حکومت پاکستان کے تعاون کا یقین بھی دلاتے ہیں۔

چند ماہ قبل جناب اوبامہ کے متعلق ہم نے اپنی بھولی بھالی قوم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ امریکا پاکستان نہیں کہ جہاں افراد یا سیاسی جماعتیں ذاتی خیالات و مفادات کے زیر اثر پالیسیاں تشکیل دیں امریکہ میں صدر چاہے کوئی آئے اس کی پالیسیاں وہاں کے شہہ دماغ......تھنک ٹینک...... امریکی مفادات کے مطابق بناتے ہیں اور امریکی حکومت کو ان پالیسیوں پر چلانا، اور حکم رانوں سے ان پر عمل کرانا بھی انہی شہہ دماغوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لہٰذا جناب اوبامہ کا یہ بیان ہمارے نزدیک نہ کوئی غیر متوقع ہے اور نہ ہی حیرانگی کا باعث۔ امریکہ بلکہ کم و بیش ترقی یافتہ و ترقی پذیر مما لک کے حکم ران تو اپنے مما لک کے وفادار ہوتے ہیں۔ باقی رہی ہمارے صدر گرامی کی تائید اور ساتھ چلنے کی فراخدلانہ پیشکش! تو ہم وسیع تر قومی مفاد کی خاطر رموز مملکت خسروان دانند کہہ سکتے ہیں یا پھر واللہ اعلم بالصواب۔

آپ دیکھیں کہ جناب اوبامہ کے آنے سے پہلے شروع ہونے والے فضائی حملے اب تک جاری ہیں کیا اوبامہ یہ حملے روک سکے ہیں؟ ہماری آزاد اخارجہ پالیسی، خودمختاری اور ڈکٹیشن نہ لینے کی انتہا یہ ہے کہ ہم یہ حملے رکوانے کے لیے امریکہ کو وارننگ دینے کی بجائے اس کے آگے ممیا رہے ہیں، عرض گزار رہے ہیں، یادداشتیں پیش کررہے ہیں اور وہ کبھی القاعدہ قیادت کے نام پر، کبھی طالبان کے نام پر، کبھی جنگجوؤں کے ٹھکانوں کے نام پر اور کبھی غیر ملکی دہشت گرد ختم کرنے کے نام پر وہ فضائی حملے اب تک جاری رکھے ہوئے ہے۔ کیوں کہ یہ وہ ان کے شہہ دماغوں کی حکمت عملی ہے جو انھوں نے امریکی مفادات کے لیے تشکیل دی ہے اور جس پر حکم ران چلنے کے پابند ہیں۔

## لانگ مارچ کی ''بے مثال'' کامیابی

حکومتی اعلانات کے مطابق حالات کی خرابی کے باعث پنجاب میں گورنر راج لگا دیا گیا تھا اور اب جب کہ لانگ مارچ 'جس کو روکنے کے لیے

یہ راج لگایا گیا تھا' کامیاب ہو چکا ہے، نیز اسی گورنر راج کے ''زریں عہد'' میں لبرٹی میں دہشت گردی کی ایسی انوکھی واردات ہوئی جس میں انتظامی کوتاہیوں کے علاوہ دہشت گرد بڑے اطمینان سے فرار بھی ہو گئے تھے اور ابھی تک اس کی تفتیش جاری ہے جو ہنوز نامکمل تھی کہ مناواں پولیس ٹریننگ کیمپ میں لبرٹی جیسی لیکن اس سے زیادہ خوفناک دہشت گردی کی واردات رونما ہو چکی ہے۔ نیز خالص ہندوانہ رسم بسنت کی اجازت اسی تاثیر راج کی سیئات میں سے ہے جس کے اثراتِ بد کے نتیجہ میں کئی بچے زخمی ہو چکے ہیں اور مغفور نام کا ایک جوان غریب اخبار فروش جاں بحق بھی ہو چکا ہے۔

اب حکم حاکم یہ آیا ہے کہ حالات اب پہلے سے بہتر ہو چکے ہیں لہٰذا گورنر راج اٹھایا جا رہا ہے۔ واہ سبحان اللہ

خرد کا نام جنوں رکھ دیا اور جنوں کا خرد      جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

لانگ مارچ میں میاں صاحب کی قائدانہ شرکت، منزل مقصود (G.P.O چوک) میں ان کا فاتحانہ ورود اور پھر انہی کے جلو میں جلوس کی روانگی اور گوجراں والا پہنچ کر لانگ مارچ حیران کن انداز میں کامیاب بھی ہو گیا، ججز بھی بحال کر دیئے گئے، نااہلی کیس کی نظر ثانی کا فیصلہ بھی سنا دیا گیا اور میثاقِ جمہوریت کو طاق نسیاں سے اتار کر اس کی جھاڑ پونچھ کر کے عمل کے جذبے سے اس کی دہرائی بھی شروع کر دی گئی۔ اہل نظر کا ماتھا تو اس وقت ٹھنکا تھا جب یہ کچھ ہو رہا تھا کہ

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام      ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

کیوں کہ حالات پس چلمن غمزہ و ادا کی چغلی کھا رہے تھے جس کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے جگر کے مصرع ع ''جیتا'' بغیر اذن کے کب تھی مری مجال۔ کو بگاڑ کر ایک موہوم خدشے کا اظہار کر دیا تھا کہ آج کے اخبارات کے مطابق وہ خدشہ متشکل طور پر یوں سامنے آ گیا کہ جناب میاں نواز شریف نے بھی اوبامہ کی پالیسیوں کے ساتھ چلنے پر آمادگی کا بالجہر اظہار کر دیا ہے جس سے ہم حسن ظن کے اس دائرے سے جلد ہی نکل آئے کہ میاں صاحب دوسری ٹرم والے میاں صاحب نہیں۔ ہم جیسے نیاز مندوں کا خیال تھا کہ شاید میاں صاحبان طوق کی بادشاہی سے آزادی کے فقر کو ترجیح دیں گے لیکن یہ نہیں ہو سکا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

چند دن قبل میاں صاحب کی طرف منسوب ایک بیان چھپا تھا کہ میں اب صدر یا وزیر اعظم نہیں بننا چاہتا لیکن آج میاں صاحب نے تیسری بار وزیر اعظم بننے پر پابندی ختم کرانے کے عزم کا اظہار یہ کہہ کر کر دیا کہ مجھے ابھی اتنی جلدی نہیں میں پانچ سال انتظار کر سکتا ہوں جسے خواہش خوابیدہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ تاہم محسوس یہ ہوا کہ میاں صاحب چاہتے ہیں کہ (ان کے سیاسی) عرق انفعال کو اب کوئی موتی جان کر چن ہی لے کہ اب

بے چین ہے بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں      دل ماہی بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

عدالت عظمیٰ کے سامنے گم شدہ افراد کے ورثاء کے مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن عدالت عظمیٰ نے فی الحال تیل اور گیس میں ریلیف دینے کے لیے کمیشن مقرر کر دیا ہے کہ عوام کو یہ ریلیف جلد از جلد ملے۔ میاں صاحب لٹیروں سے لوٹی دولت واپس لینے کی بجائے ''فی الوقت جہاں ہے جیسی ہے'' کے زریں اصول پر حکومت سے باہم مل کر اور متعاون ہو کر جمہوریت کا تسلسل چاہ رہے ہیں۔ گورنر راج بھی ختم ہو گیا اور نااہلی کیس پر حکم امتناعی ملنے کے باعث پنجاب حکومت بھی بحال ہو گئی یہ سب ''لانگ مارچ'' کی ''بے مثال کامیابی'' ہی کے تو ثمرات ہیں۔ اب جناب خادم اعلیٰ پنجاب نے روٹی دو روپے کی بجائے ایک روپے میں دینے کا اعلان کر کے عوام کے دل ''موہ'' لیے جس سے لوگ چند روز میں گورنر راج کی راتوں کی باتیں بھول ہی جائیں گے کہ ان کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔

# اسلام کا نظریہ زر اور کاغذی کرنسی کی حقیقت! ❷

حافظ ذوالفقار علی، ابو ہریرہ شریعہ کالج لاہور

## کرنسی نوٹ کی شرعی حیثیت:

اب نوٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے اس کے بارے میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔

❀......پہلی رائے یہ ہے کہ نوٹ اصل میں اس بات کا دستاویزی ثبوت ہیں کہ حامل نوٹ نے اس نوٹ کے جاری کنندہ سے اتنا سونا یا چاندی وصول پانی ہے۔اس کے حق میں سب سے مضبوط دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ نوٹ پر یہ الفاظ تحریر ہوتے ہیں:

''حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا۔''

اس رائے کے مطابق نوٹوں کے ساتھ سونا چاندی خریدنا جائز نہیں۔کیوں کہ نوٹ کے ساتھ خریداری کا مطلب حقیقت میں اس سونے یا چاندی کے ساتھ خریداری ہے جو اس نوٹ کی پشت پر ہے۔اور شرعی اعتبار سے سونے کی سونے یا چاندی کی سونے کے ساتھ بیع میں دونوں طرف سے موقع پر قبضہ شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔کیوں کہ خریدار نے سونے کے بدلے سونا نہیں دیا بلکہ اس کی رسید دی ہے۔چناں چہ تفسیر ''اضواء البیان'' کے مصنف علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

"وأنها سند بفضة وأن المبيع الفضة التى هى سند بهـا ومـن قـرأ الـمـكتوب عليها فهم صحة ذلك، وعـلـيـه فلا يجوز بيعها بذهب ولا فضة ولو يداً بيد لـعدم الـمـنـاجزة بسبـب غيبة الـفـضة الـمدفوع سندهـا۔"

[اضواء البیان فی تفسیر القرآن بالقرآن، ج:۱، ص:۲۰۷]

''یہ نوٹ چاندی کی رسید ہیں اور بیچی گئی چیز وہ چاندی ہے جس کی یہ رسید ہیں۔جو ان پر لکھی عبارت پڑھے گا وہ اس رائے کا درست ہونا سمجھ جائے گا۔اس رائے کے مطابق نوٹوں کی سونے چاندی کے بدلے بیع چاہے نقد ہو جائز نہیں۔کیوں کہ جس چاندی کی رسید دی جاتی ہے وہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے دونوں طرف سے موقع پر قبضہ کی شرط نہیں پائی جاتی۔''

جس طرح اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹوں کے بدلے سونا چاندی خریدنا جائز نہیں اسی طرح نوٹوں کے ساتھ مشارکہ یا بیع سلم درست نہیں۔کیوں کہ اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹ دَین **(Debt)** کی رسید ہے جب کہ شرعی اعتبار سے شراکت اور سلم میں سرمایہ نقد ہونا ضروری ہے۔علاوہ ازیں یہ رائے اختیار کر کے ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ بھی نہیں ہوسکتا۔کیوں کہ یہ سونے کے بدلے سونے کی ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ بیع ہوگی جو شرعاً درست نہیں۔

مگر یہ موقف درست نہیں کیوں کہ اب نوٹ قرض کی رسید نہیں رہا۔جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا ہے بلکہ اب یہ خود قانونی زر بن چکا ہے اور ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں کہ حکومت کوئی بھی چیز بطور زر اختیار کر سکتی ہے۔اب نوٹ پر لکھی اس عبارت ''حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا۔'' کا مطلب صرف یہ ہے کہ حکومت اس کی ظاہری قیمت کی ذمہ دار ہے۔جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المتروک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''نوٹ رسید نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر یہ گم یا تلف ہو جائے تو اس کا مالک جاری کنندہ سے مطالبہ نہیں کر سکتا خواہ اس کے پاس ہزار گواہ ہو اور اگر یہ حقیقی رسید ہوتا تو اس کو ضرور یہ اختیار ہوتا۔کیوں کہ قرض مقروض کے ذمے ہوتا ہے رسید

تلف ہونے سے ضائع نہیں ہوتا۔'' [الربا والمعاملات المصرفية فی نظر الشريعة الاسلامية، ص:۳۲۱]

❀......بعض نامور علماء کے نزدیک نوٹ سامان (جنس) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مشہور مالکی فقیہ علیش مصری کی بھی یہی رائے ہے۔ علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" وممن أفتی بأنها كعروض التجارة العالم المشهور عليش المصری صاحب النوازل، وشرح مختصر خليل، وتبعه فی فتواه بذلك كثير من متأخری علماء المالكية ـ" [اضواء البيان فی تفسير القرآن بالقرآن، ج:۱، ص:۲۰۷]

''جن حضرات نے ان کے سامان تجارت ہونے کا فتویٰ دیا ہے ان میں ''نوازل'' اور ''شرح مختصر خلیل'' کے مصنف مشہور عالم علیش مصری بھی شامل ہیں۔ بعد کے اکثر مالکی علماء نے بھی ان کے فتویٰ کی پیروی کی ہے۔''

اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نوٹ قیمت بننے کی صلاحیت سے عاری ہے۔ کیوں کہ یہ نہ سونا ہے اور نہ چاندی یہ تو سامان کی مانند ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق ایک نوٹ کا دو نوٹوں کے ساتھ تبادلہ درست ہے۔ اسی طرح اس نظریہ کے مطابق نوٹوں میں زکوٰۃ اسی صورت واجب ہوگی جب ان کو فروخت کرکے نفع کمانا مقصود ہو۔ مزید برآں اس قول کی بنیاد پر نوٹ سے مضاربہ اور بیع سلم بھی جائز نہیں بنتی۔ کیوں کہ یہ قیمت نہیں سامان ہے۔ چوں کہ یہ نظریہ خطرناک نتائج کا حامل ہے اس لیے عصر حاضر کے اہل علم اس کی تائید نہیں کرتے۔

❀......تیسری رائے یہ ہے کہ نوٹ سونے، چاندی کا متبادل ہیں۔ اگر اس کے پیچھے سونا ہو تو سونے اور اگر چاندی ہو تو چاندی کا متبادل ہوگا۔ جسٹس ڈاکٹر عبداللہ بن سلیمان منیع لکھتے ہیں:

''اس نظریہ کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ قیمت کے اعتبار سے یہ نوٹ اپنی اس اصل کی طرح ہے جس کے یہ بدل ہیں یعنی سونا اور چاندی۔ کیوں کہ ان کا اصل چاندی یا سونا ان کی پشت پر ان کے زر ضمانت کے طور پر موجود ہے اور مقاصد شرعیہ کا تعلق تو اصل اور حقائق سے ہے نہ کہ الفاظ اور ان کی بناوٹ سے۔''

[کاغذی کرنسی کی تاریخ، ارتقاء، شرعی حیثیت، ص:۶۰]

اس نقطہ نظر کے مطابق نوٹوں کے باہمی لین دین میں سود کے احکام بھی جاری ہوں گے اور جب یہ دو سو درہم چاندی یا بیس دینار سونے کی قیمت کے مساوی ہوں تو سال کے بعد ان پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اسی طرح ان کے ذریعے بیع سلم بھی درست ہوگی۔

لیکن یہ رائے بھی کمزور ہے کیوں کہ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا یا چاندی ہے حالاں کہ امر واقع میں ایسا نہیں۔ چناں چہ جسٹس علامہ عبداللہ بن سلیمان منیع اس کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ نظریہ بھی حقیقت واقعہ کے مطابق نہ ہونے کی بنا پر قابل التفات نہیں کیوں کہ اس کا دارومدار کرنسی نوٹوں کی اصل پر ہے اور اصل جیسا کہ ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ وہ تو کرنسی نوٹوں کی پشت پر ہے نہیں۔ بلکہ اکثر ممالک کے نوٹ محض ساکھ کی بنا پر، زبانی ضمانتوں اور حکومتوں کے جاری کردہ ہونے کی بنا پر رائج اور قابل قبول ہیں ورنہ ان کے پیچھے نہ تو سونا ہے نہ چاندی۔ بلکہ کچھ ایسے ہیں جنھیں پراپرٹی کی ضمانت حاصل ہے اور کچھ کو محض اقتدار کی ضمانت۔ لہٰذا یہ نظریہ خلاف واقعہ ہونے کی بناء پر بہت کمزور ہے۔''

[کاغذی کرنسی کی تاریخ، ارتقاء، شرعی حیثیت، ص:۶۱]

❀......نوٹ کی شرعی حیثیت کے متعلق چوتھی رائے یہ ہے کہ نوٹ دھاتی سکوں (فلوس) کی طرح اصطلاحی زر ہیں جیسا کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے لکھا ہے:

" الرابع ما هو سلعة بالاصل وثمن بالاصطلاح كالفلوس ...... الی ان قال اذا علمت هذا فالنوط هو من القسم الرابع سلعة باصله لأنه قرطاس وثمن بالاصطلاح لأنه يعامل به معاملة الاثمان "

[كفل الفقيه الفاهم فى أحكام قرطاس الدراهم، ص:٣٣]
''مال کی چوتھی قسم وہ ہے جو اصل میں تو مال ہے لیکن اصطلاحی لحاظ سے زر ہے جیسے دھاتی سکے ہیں...... جب یہ معلوم ہوگیا تو سنونوٹ کا تعلق چوتھی قسم سے ہے جو حقیقت میں سامان ہے کیوں کہ یہ کاغذ ہے اور اصطلاحی طور پر زر ہے کیوں کہ اس سے زر جیسا معاملہ کیا جاتا ہے۔''

لیکن یہ رائے بھی قوی معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ اہل علم کے ہاں دھاتی سکوں میں زر کی بجائے سامان کا پہلو غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور فقہاء نہ تو کمی بیشی کے ساتھ ان کا تبادلہ مکروہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ان کو شراکت ومضاربت میں رأس المال بنانے کی اجازت دیتے ہیں۔ نیز ان میں زکوٰۃ بھی اسی صورت واجب قرار دیتے ہیں جب ان کو فروخت کرکے نفع کمانا مقصود ہو۔ جیسا کہ ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' میں ہے:

" الأصح عند الشافعية والصحيح عند الحنابلة وهو قول الشيخين من الحنفية وقول عند المالكية: أنها ليست أثمانا ربوية وأنها كالعروض ۔" [الموسوعة الفقهية الكويتية: ماده فلوس]

''امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف رحمہما اللہ اور مالکی فقہاء کا قول، حنابلہ کا صحیح مسلک اور شافعیوں کا صحیح ترین نقطہ نظر یہی ہے کہ دھاتی سکوں میں ربا نہیں ہے بلکہ یہ سامان کی طرح ہیں۔''

" ذهب جمهور الفقهاء ابو حنيفة وابو يوسف والمالكية على المشهور والشافعية والحنابلة الى أن المضاربة لا تصح بالفلوس لأن المضاربة عقد غرر جوز للحاجة فاختص بما يروج غالبا و تسهل التجارة به وهو الاثمان ۔"

[الموسوعة الفقهية الكويتية: ماده مضاربة]

''امام ابوحنیفہ، ابویوسف، مالکی (مشہور مسلک کے مطابق) شافعی اور حنبلی فقہاء کا خیال ہے کہ دھاتی سکوں کے ذریعے مضاربہ درست نہیں۔ کیوں کہ مضاربہ عقد غرر ہے جو ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا گیا ہے۔ چناں چہ یہ انہی چیزوں کے ساتھ خاص رہے گا جو اکثر مروّج ہوں اور ان کے ساتھ تجارت آسان ہو۔ اور وہ نقدیاں ہیں۔'' یعنی دھاتی سکے زر نہیں۔

" فذهب الشافعية والحنابلة الى أن الفلوس كالعروض فلا تجب الزكاة فيها الا اذا عرضت للتجارة ۔" [الموسوعة الفقهية الكويتية: ماده فلوس]

''شافعی اور حنبلی فقہاء کی رائے میں دھاتی سکے سامان کی طرح ہیں چناں چہ ان میں زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب یہ تجارت کی غرض سے ہوں۔''

ان فقہاء کے نقطہ نظر کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کسی حدیث میں دھاتی سکوں کی زکوٰۃ کا تذکرہ نہیں ملتا حالاں کہ عہد نبوی میں یہ موجود تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اگر یہ زر ہوتے تو سونے چاندی کی طرح ان کی زکوٰۃ کا بھی ذکر ہوتا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس روایت کہ انھوں نے اپنی لونڈی سے کہا: ''اس کے فلوس خرید لو۔'' سے بھی یہ اشارہ نکلتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں دھاتی سکے سامان شمار ہوتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فقہائے احناف کے نزدیک دھاتی سکے زر ہیں اسی لیے وہ ان میں زکوٰۃ بھی واجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف رحمہما اللہ کے نزدیک متعاقدین دھاتی سکوں کو متعین کرکے ان کی زری حیثیت ختم کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ سامان کے حکم میں ہوتے ہیں اور ان حضرات کے نزدیک کمی بیشی کے ساتھ ان کا تبادلہ بھی صحیح ہوتا ہے۔

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ فقہاء کی نظر میں دھاتی سکے (فلوس) یا تو زر ہی نہیں یا پھر ناقص زر ہیں۔ اسی لیے وہ ان سے زر کا وصف ختم کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جو صورت بھی ہو بہرحال کرنسی نوٹوں کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ نہ تو دھاتی سکوں کی طرح ان میں سامان کا پہلو غالب ہے یہ تو محض کاغذ کے ٹکڑے ہیں ان کی جو

حیثیت بھی ہے وہ ان کی پشت پر حکومتی ضمانت کی وجہ سے ہی ہے اور نہ ہی متعاقدین کو ان کی زری حیثیت کالعدم کرنے کا اختیار ہے کیوں کہ یہ قانونی زر ہیں۔

❀......اس سلسلہ میں پانچویں اور آخری رائے یہ ہے کہ نوٹ سونے چاندی کی طرح مستقل زر ہے کیوں کہ نوٹوں میں زر کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔قیمتوں کا پیمانہ اور قابل ذخیرہ بھی ہیں اور لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے ہیں شرعی اعتبار سے یہی زر کی حقیقت ہے جیسا کہ ہم شروع میں امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کر آئے ہیں۔

''اگر لوگ اپنے درمیان چمڑوں کے ذریعے خرید وفروخت کو رائج کردیں یہاں تک کہ وہ چمڑے ثمن اور سکہ کی حیثیت اختیار کر جائیں تو میں سونے چاندی کے بدلے ان چمڑوں کو ادھار فروخت کرنا پسند نہیں کروں گا۔''

اس کا مطلب ہے کہ کسی بھی چیز کو خواہ وہ چمڑا ہی کیوں نہ ہو بطور زر اختیار کیا جا سکتا ہے۔اس کی تائید امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔

" أمـا الـدرهـم والدينار فما يعرف له حد طبعي ولا شـرعـي بـل مرجعه الى العادة والاصطلاح وذلك لأنه فى الأصل لا يتعلق المقصود به بل الغرض أن يـكـون معيارا لما يتعاملون به والدراهم والدنانير لا تـقـصد لنفسها بل هى وسيلة الى التعامل بها ولهذا كـانـت أثمانا بخلاف سائر الأموال فان المقصود الانتـفـاع بهـا نـفسها فلهذا كانت مقدرة بالأمور الـطبيـعة أو الشـرعية والـوسيـلة الـمحضة التى لا يتـعـلق بها غرض لا بمادتها ولا بصورتها يحصل بها المقصود كيف ما كانت ـ"

[مجموع الفتاویٰ، ج:۱۹، ص:۲۵۱،۲۵۲]

''اس کا خلاصہ یہ ہے کہ درہم ودینار کی کوئی ذاتی اور شرعی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق عرف اور اصطلاح سے ہے۔ کیوں کہ درہم ودینار بذات خود مقصود نہیں ہوتے بلکہ یہ باہمی لین دین کا ذریعہ ہیں اسی لیے یہ قیمت شمار ہوتے ہیں چوں کہ باقی اموال سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے اس لیے ان کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ وہ ذریعہ جس کے مادہ اور صورت سے کوئی غرض وابستہ نہ ہو وہ جیسا بھی ہو اس سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔''

چوں کہ دلائل کے لحاظ سے یہ نقطہ نظر قوی ہے اور اس پر کیے گئے اعتراضات بھی زیادہ وزنی نہیں۔ اس لیے دور حاضر کے علماء کی اکثریت، بیشتر مفتیانِ کرام کے فتاویٰ اور اہم فقہی اداروں کی قراردادیں اسی کے حق میں ہیں۔

جسٹس علامہ عبداللہ بن سلیمان منیع کی بھی یہی رائے ہے۔

[کاغذی کرنسی کی تاریخ، ارتقاء، شرعی حیثیت، ص:۹۰]

سعودی کبار علماء کی مجلس نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔

[المجلة البحوث الاسلامية، ع:۱، ص:۲۲۱]

جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ بھی اسی قول کے حق میں ہیں۔ چناں چہ وہ مذکورہ بالا آراء اور ان کے دلائل کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''کاغذی زر کے متعلق علماء کی آراء اور ہر ایک کے نقطہ نظر کا تنقیدی جائزہ لینے سے ہمیں ان کا قول راجح معلوم ہوتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نوٹ مستقل کرنسی ہے اور سونے چاندی کی طرح ان میں بھی سود کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ ربا، سود اور تلف کی صورت میں ضمان کے مسائل میں ان پر مکمل طور پر سونے چاندی کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔'' [الربا والمعاملات المصرفية فى نظر الشريعة الاسلامية، ص:۳۳۹]

دوسرے اقوال کی خرابیاں واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دوسرے اقوال یا تو معاملات میں لوگوں کو مشکل میں ڈال دیں گے یا لین دین کا دروازہ ہی بند کر دیں گے۔ حالاں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں یا پھر سود کا دروازہ چوپٹ کھول دیں گے اور نقدین کی زکوٰۃ ضائع کرنے کے حیلوں کا دروازہ کھولیں

گے۔" [حوالہ مذکورہ]

## کاغذی کرنسی کا نصابِ زکوٰۃ:

کاغذی نوٹ کو مستقل کرنسی قرار دینے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس پر زکوٰۃ کس حیثیت سے عائد ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب نوٹ سونے، چاندی میں سے جس کے نصاب کی مالیت کم ہو، کے برابر ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کیوں کہ بحیثیت نقدی یہ سونے چاندی کے مشابہ ہیں۔

سونے کا نصاب ساڑھے سات اور چاندی کا ساڑھے باون تولے ہے۔ چوں کہ سونے کے مقابلہ میں چاندی کے نصاب کی مالیت کم ہے اس لیے نصابِ زکوٰۃ کے لیے چاندی کا اعتبار کیا جائے گا۔ لہٰذا جب نوٹ ساڑھے باون تولے چاندی کے مساوی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ تو پھر سونے چاندی کی طرف ہی رجوع ہوا گویا سونا چاندی اصل ہیں اور کرنسی ان کی نمائندہ۔

راقم الحروف کے خیال میں یہ مسئلہ کی غلط توجیہ ہے مشابہت کی بنا پر وجوب زکوٰۃ اور وقوع ربا میں سونے، چاندی کو معیار بنانے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ کاغذی کرنسی سونے چاندی کی نمائندہ ہے۔

## مختلف کرنسیوں کا باہمی تبادلہ:

جب کاغذی کرنسی بحیثیت زرسونے، چاندی جیسی ہے تو سونے، چاندی کی طرح کرنسی کی خرید وفروخت بھی صحیح ہے۔

شریعت نے سونے کے عوض سونے اور چاندی کے بدلے چاندی کے تبادلہ میں برابری اور دونوں طرف سے فوری ادائیگی کی شرط لگائی ہے لیکن جب چاندی اور سونے کا باہمی تبادلہ ہو تو پھر صرف فریقین کی جانب سے موقع پر ادائیگی ضروری قرار دی ہے۔ تفاوت کو جائز رکھا ہے جیسا کہ ذیل کی حدیث میں ہے:

" اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَإِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْأَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ إِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔"

[صحیح مسلم باب الصرف وبیع الذهب]

"سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے اور نمک نمک کے عوض مقدار میں مساوی ایک جیسے اور نقد بنقد ہونے چاہئیں۔ جب یہ قسمیں تبدیل ہو جائیں تو پھر جیسے چاہو بیچو بشرط کہ دونوں طرف سے نقد ہو۔"

اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ سونے اور چاندی کا آپس میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ درست ہے۔ کیوں کہ یہ اپنی ذاتی قیمت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

جس طرح سونا، چاندی اپنی ذاتی قیمت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان کا آپس میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے اسی طرح ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے مختلف ہے۔ کیوں کہ ہر کرنسی اپنے ملک کے اقتصادی حالات کی وجہ سے اپنی ایک خاص قیمت رکھتی ہے۔ لہٰذا ایک کرنسی کا دوسری کرنسی سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے، بشرط کہ دونوں جانب سے ادائیگی نقد ہو جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں "جب نقد بنقد ہو" کے الفاظ ہیں۔

جسٹس علامہ عمر بن عبدالعزیز المترک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نام، صفات اور جاری کنندہ کے اعتبار سے ان کی مختلف اجناس ہیں۔ سعودی ریال ایک جنس ہے، مصری پونڈ الگ جنس ہے، عراقی دینار مختلف جنس ہے، شامی لیرا، لبنانی لیرا، امریکی ڈالر اور آسٹریلوی ڈالر الگ الگ اجناس ہیں۔ جیسے گندم اور جَو اگرچہ دونوں دانوں کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں مگر ایک دوسرے سے علیحدہ جنس شمار ہوتے ہیں۔ ایسے ہی گندم اور جَو کا آٹا ہے اگرچہ دونوں پر آٹے کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہ مختلف اجناس ہیں۔ اس بنا پر ایک جنس کی اپنی ہی جنس سے ادھار اور کمی بیشی کے ساتھ بیع درست نہیں۔ البتہ دوسری جنس کے ساتھ کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ہوسکتا ہے مگر ادھار یہاں بھی

درست نہیں۔اسی طرح ان کی سونے چاندی کے ساتھ نقد بیع درست ہے مگر ادھار صحیح نہیں۔یہی قول صحیح ہے ''ان شاء اللہ'' کیوں کہ یہ مقاصد شریعت اور اس مصلحت کے موافق ہے جس کی وجہ سے سونے چاندی میں ربا حرام قرار دیا گیا ہے۔'' [الربا والمعاملات المصرفية فى نظر الشريعة الاسلامية، ص: ۳۳۹]

جس طرح دو مختلف کرنسیوں کا باہم اختلاف کے ساتھ لین دین درست ہے اسی طرح ایک کرنسی میں واجب شدہ مالی حق کی ادائیگی بھی دوسری کرنسی میں ہوسکتی ہے۔مثلاً ایک شخص نے پاکستانی روپے میں کوئی معاملہ طے کیا ہے لیکن بوقت ادا وہ کسی وجہ سے پاکستانی روپے کی بجائے سعودی ریال یا امریکی ڈالر میں ادائیگی کرنا چاہے تو شرعاً اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تاہم اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں کرنسیوں کے تبادلے کی اس شرح کو بنیاد بنا دیا جائے جو ادائیگی کے دن ہو، اور مقروض وہ ریال یا ڈالر اسی مجلس میں صاحب حق کے سپرد کردے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

" كُنتُ أَبِيعُ الْإِبِلَ بِالْبَقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ آخُذُ هٰذِهِ مِنْ هٰذِهِ وَأُعْطِى هٰذِهِ مِنْ هٰذِهِ فَأَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ فِيْ بَيْتِ حَفْصَةَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رُوَيْدَكَ أَسْأَلُكَ إِنِّيْ أَبِيعُ الْإِبِلَ بِالْبَقِيعِ فَأَبِيعُ بِالدَّنَانِيرِ وَآخُذُ الدَّرَاهِمَ وَأَبِيعُ بِالدَّرَاهِمِ وَآخُذُ الدَّنَانِيرَ آخُذُ هٰذِهِ مِنْ هٰذِهِ وَأُعْطِى هٰذِهِ مِنْ هٰذِهِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا بَأْسَ أَنْ تَأْخُذَهَا بِسَعْرِ يَوْمِهَا مَا لَمْ تَفْتَرِقَا وَبَيْنَكُمَا شَيْءٌ۔" [سنن ابى داؤد باب فى اقتضاء الذهب من الورق]

''میں بقیع جگہ پر اونٹ فروخت کرتا تھا تو کبھی دیناروں میں فروخت کرتا اور درہم وصول کرتا اور کبھی دراہم میں بیچتا لیکن دینار وصول پاتا۔یعنی دنانیر کی بجائے دراہم اور دراہم کی بجائے دنانیر لیتا۔تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ذرا ٹھہریئے میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔میں بقیع میں اونٹ بیچتا ہوں دینار کے ساتھ بیچ کر درہم اور درہم کے ساتھ بیچ کر دینار سے وصولی پاتا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں بشرط کہ اسی دن کے ریٹ کے مطابق ہو اور تمہارے درمیان اس طرح جدائی نہ ہو کہ کوئی لین دین باقی ہو۔''

## ملکی کرنسی کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ:

چوں کہ ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹ یکساں اوصاف کے حامل ہونے کی وجہ سے ایک ہی جنس شمار ہوتے ہیں۔اس لیے ان کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کسی صورت جائز نہیں ہے۔مولانا احمد رضا خاں بریلوی چوں کہ نوٹوں کو دھاتی سکوں پر قیاس کرتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک متعاقدین دھاتی سکوں سے زر کا وصف ختم کرکے بحیثیت جنس ایک سکے کے ساتھ دو سکوں کا تبادلہ کرسکتے ہیں جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے۔اس لیے مولانا احمد رضا خاں بریلوی دس روپے کے نوٹ کو بارہ روپے میں بیچنا جائز سمجھتے ہیں۔دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ نوٹ اصطلاحی زر ہے اور اس معاملہ میں کسی دوسرے کو متعاقدین پر کوئی اختیار نہیں وہ دونوں جو کمی بیشی کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ چناں چہ ایک استفتاء کے جواب میں لکھتے ہیں:

" يجوز بيعه بأزيد من رقمه وبأنقص منه كيفما تراضا لما علمت أن تقديرها بهذه المقادير انما حدث باصطلاح الناس وهما لا ولاية للغير عليهما كما تقدم عن الهداية والفتح فلهما أن يقدرا بما شاء ا من نقص وزيادة ۔" [كفل الفقيه فى أحكام قرطاس الدراهم، ص: ۵۵]

''نوٹ کو اس کی مالیت سے کم یا زائد جس قیمت پر بھی وہ متفق ہوجائیں بیچنا جائز ہے کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ ان کی یہ قیمت لوگوں کی اصطلاح کی بنا پر ہے۔لہٰذا ان دونوں کو یہ

اختیار ہے کہ جو کمی بیشی چاہیں کریں۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دھاتی سکوں کے متعلق امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے لیکن اس کو کرنسی نوٹوں پر منطبق کرنا کسی صورت درست نہیں۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

❀......نوٹ قانونی زر ہے حکومت کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کی قانونی حیثیت کالعدم قرار دے سکے۔

❀......دھاتی سکے ایسی دھات کے ہوتے ہیں جس کی کچھ نہ کچھ ذاتی افادیت بھی ہوتی ہے۔ جب کہ نوٹوں کا لین دین زر سمجھ کر ہی کیا جاتا ہے اگر ان کے اندر سے یہ وصف نکال دیا جائے تو ان کی حیثیت ردّی کاغذ کے برابر رہ جاتی ہے جس سے کسی کو خاص دلچسپی نہیں ہوسکتی۔

❀...... یہ فتویٰ سودی کاروبار کے لیے بطور ڈھال استعمال ہوسکتا ہے وہ یوں کہ قرض دہندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس کو قرض نہیں دیا بلکہ اپنے نوٹ ادھار زائد قیمت پر فروخت کیے ہیں اس طرح وہ جتنا سود چاہے لے سکتا ہے۔

بریلوی علماء بھی اس بات کے قائل ہیں کہ اس طرح سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا۔ چناں چہ مشہور بریلوی عالم مولانا غلام رسول سعیدی لکھتے ہیں:

''اگر قرض دینے والا اپنے قرض کے بدلے سود لینا چاہے گا تو وہ اس طرح بآسانی لے سکے گا کہ قرض دار کو اپنے کرنسی نوٹ زیادہ قیمت پر فروخت کرے گا اس طرح وہ اپنے قرض کے بدلے سود حاصل کرے گا۔'' [شرح صحیح مسلم، ج:۴،ص:۳۶۶]

مندرجہ بالا بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کرنسی نوٹوں کے زر ہونے میں اب کوئی اشکال نہیں رہا اس لیے اہل علم سود اور زکوٰۃ کے معاملہ میں بلا تردد ان پر سونے، چاندی کے احکام منطبق کرتے ہیں۔

## قرضوں کی اشاریہ بندی:

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ کاغذی کرنسی کی تیزی کے ساتھ گرتی ہوئی قیمت کے ہماری معیشت پر ناخوشگوار اثرات مرتب ہورہے ہیں اور لوگوں کے معاشی مسائل بڑھ رہے ہیں۔ بالخصوص کم آمدن والا طبقہ بہت بری طرح متاثر ہورہا ہے۔ اصحاب ثروت میں قرض حسنہ کا جذبہ ماند پڑ رہا ہے۔ لوگ کسی فاقہ مست کو قرض دینے کی بجائے سونا یا زمین خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں جو رقم ہم آج بطور قرض دیں گے چھ مہینے بعد اس سے وہ چیز حاصل نہیں ہوسکے گی جو آج ہوسکتی ہے۔ لہٰذا قرض دینے کی بجائے بہتر ہے اس سرمایہ سے سونا یا کوئی جائیداد خرید لی جائے۔ یوں اسلامی اقدار پامال ہورہی ہیں۔

اس کا اصل حل تو یہی ہے کہ حکومت افراطِ زر کے عوامل دور کرکے کرنسی کی قدر میں استحکام پیدا کرے لیکن بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ امدادی قدم کے طور پر قرضوں کو قیمتوں کے اشاریہ سے منسلک کردیا جائے تاکہ اس کے مضر اثرات پر قابو پایا جاسکے اور قرض دہندگان کے سرمایہ کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ ہوسکے۔ یوں قرض دہی کا جذبہ بھی پروان چڑھتا رہے گا۔

اشاریہ کی مختصر اور عام فہم تعریف یوں ہے:

''ایسا نمبر جس سے یہ علم ہو کہ گردشِ ایام سے قیمتوں، تنخواہوں یا کسی دوسرے معاشی پیمانے میں کتنا تغیر واقع ہوا ہے، اشاریہ کہلاتا ہے۔''

اشاریہ بندی کے لیے ''صارف کی اشیاء کی ٹوکری'' (Basket of Consumers Goods) جس میں روزمرہ کے استعمال کی اہم اشیاء اور اجرتیں شامل ہوتی ہیں کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مالی سال کے شروع اور آخر میں اس ٹوکری میں شامل اشیاء وخدمات کی قیمتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔ پھر جس تناسب سے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی تناسب سے کرنسی کی قوت خرید میں کمی تصور کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد موٴجل ادائیگیوں کو مستحکم کرنا ہوتا ہے تاکہ حق دار نقصان نہ اٹھائیں۔

اشاریہ بندی کے اس طریقہ کار کے مطابق قرضوں کی اشاریہ بندی کا مطلب ہوگا کہ مقروض قرض کی ادائیگی کے وقت اشیاء وخدمات کی قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے زائد رقم ادا کرے۔ ان حضرات کے نزدیک یہ اس مسئلے کا بہترین حل ہے اس کے بغیر نہ تو معاملات میں عدل کے تقاضے پورے کیے جاسکتے ہیں اور نہ ہی استحصال کا خاتمہ ممکن

ہے۔لیکن اگر اس کا تحقیقی اور تجزیاتی جائزہ لیا جائے تو اس میں درج ذیل قباحتیں نظر آتی ہیں۔

❀......اس میں ربا کا پہلو پایا جاتا ہے کیوں کہ اس میں دی گئی رقم کے عوض زائد واپس کرنے کی شرط ہوتی ہے۔شرعی لحاظ سے قرض میں اس قسم کی شرط سود کے زمرہ میں آتی ہے۔

اشاریہ بندی کے حامی اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شریعت نے قرض کی واپسی کے حوالے سے جس برابری کا تقاضا کیا ہے اس سے ظاہری برابری مقصود نہیں بلکہ قیمت و مالیت اور صفت ومنفعت کے لحاظ سے برابری مراد ہے۔لہٰذا قرض دار جو زائد روپے واپس کر رہا ہے وہ اضافہ نہیں ہے بلکہ اصل میں وہی مالیت ادا کر رہا ہے جو اس نے لی تھی۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ جواب درست نہیں اس لیے کہ شرعاً زر کے لین دین اور جنس کے لین دین کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔اگر کسی شخص نے چالیس کلوگرام گندم ادھار لی ہے تو وہ اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ اس عرصہ میں اس کی قیمت میں کتنا فرق آ چکا ہو۔

اسی طرح اگر زر کی کوئی خاص مقدار قرض لی گئی ہو تو وہی مقدار واپس کی جائے گی خواہ اس عرصہ میں اشیاء وخدمات کے مقابلہ میں اس کی قدر میں کتنی تبدیلی واقع ہو چکی ہو۔یعنی قرض کی واپسی میں مقدار کا اعتبار ہے نہ کہ مالیت اور قیمت کا۔یہی وجہ ہے تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ اضافے کی شرط سے عقد قرض فاسد ہو جاتا ہے خواہ اضافہ مقدار میں ہو کہ مقروض لیے گئے مال سے زائد واپس کرے، یا کسی دوسرے مال سے ہدیہ کی صورت میں ہو، یا کوالٹی میں کہ قرض گیر قرض لی گئی چیز سے عمدہ واپس کرے۔اس قسم کا ہر اضافہ سود شمار ہوتا ہے۔

[الموسوعة الفقهية الكويتية، ج:٣٣، ص:١٣٠]

اس کے ربا ہونے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ عہد نبوی میں قرض کا لین دین بھی ہوتا تھا اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ بھی، مگر ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ فلاں قرض دہندہ نے اضافی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔

❀......مقروض نے ایک ہزار کے بدلے کتنے روپے اضافی واپس کرنے ہیں اشاریہ بندی میں اس کا تعین نہیں ہوتا۔یہ غرر (Uncertainty) ہے جو مالی معاہدوں میں ناجائز ہے۔

اشاریہ بندی کے قائلین کا موقف ہے کہ غرر تو اشاریہ بندی نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے کیوں کہ اس صورت میں فریقین کو یہ خبر نہیں ہوتی کہ بوقت ادائیگی کاغذی نوٹ کی قوت خرید کیا ہوگی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرض کی واپسی میں شرعاً عددی برابری قابل لحاظ ہے نہ کہ قیمت و مالیت کا۔مقدار میں کوئی ابہام نہیں ہے۔اس کے برعکس اشاریہ بندی میں یہ قطعاً طے نہیں ہوتا ہے کہ بوقت ادائیگی قیمت و مالیت کیا ہوگی۔

❀......اس میں ناانصافی کا پہلو بھی پایا جاتا ہے وہ اس طرح کہ ماہرین معیشت کے نزدیک کرنسی کی قدر میں کمی کے پیچھے متعدد عوامل کا مجموعی عمل کارفرما ہوتا ہے۔ماہرین کے نزدیک ان عوامل میں قرض دینا شامل نہیں۔اب قرض گیر کو ایک ایسے عمل کا ذمہ دار ٹھہرانا جس کا وہ سبب نہیں بنا کہاں کا انصاف ہے؟

اشاریہ بندی کے قائلین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب کسی کے ذمہ کوئی ادائیگی ہو اور اس دوران حکومت کرنسی کو منسوخ کر دے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ، حنبلی فقہاء کے راجح اور مالکیہ کے غیر مشہور مسلک کے مطابق مقروض کی طرف سے اسی کرنسی میں ادائیگی درست نہیں بلکہ اس قیمت کی ادائیگی واجب ہوگی جو تنسیخ زر کی تاریخ پر اس کرنسی میں بنتی تھی جس کی اساس پر معاہدہ ہوا تھا۔

[الموسوعة الفقهية الكويتية، ج:٢١، ص:٦٦ مادة دين]

حالاں کہ کرنسی کی تنسیخ میں مقروض کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔لیکن ان فقہاء نے محض اس لیے کہ جب یہ نقص واقع ہوا تھا تو وہ مقروض کے قبضہ میں تھی اس کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔اسی طرح اگرچہ مقروض کرنسی کی قدر میں کمی کا سبب نہیں مگر اس کا ازالہ اس کی ذمہ داری ہے کیوں کہ جب کمی واقع ہوتی ہے تو وہ اس کے قبضہ میں ہوتی ہے۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو اس استدلال کی کمزوری بالکل واضح ہے کیوں کہ ان فقہاء نے اس صورت میں قیمت کا اعتبار اس بنا پر کیا ہے کہ

معاہدے کے دن رائج کرنسی منسوخ ہونے کی وجہ سے مثل سے ادائیگی ممکن نہیں رہی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کسی طور پر درست نہیں کہ کرنسی کی قدر میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہے۔

اشاریہ بندی میں ناانصافی کا پہلو یہ بھی ہے کہ انسان عموماً پس انداز رقم ہی بطورقرض دیتا ہے۔ اور ہر بچت کار کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے، کوئی پلاٹ خریدنے کے لیے بچت کرتا ہے، کوئی سونا خریدنا چاہتا ہے اور کوئی مکان تعمیر کرنا۔ شاذ ونادر ہی کوئی ایسا بچت کار ہوگا جس کے پیش نظر اشیاء کی ٹوکری ہو۔ سب بچت کاروں کے لیے اشیاء کی ٹوکری کو اساس بنانا مضحکہ خیز ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ صرف قیمتیں بڑھنے کی صورت میں اشاریہ بندی کی جاتی ہے کمی کی صورت میں نہیں کی جاتی۔ کیوں کہ اس پر کوئی عمل کرنے کو تیار نہیں ہوگا۔ اگر اشاریہ بندی عدل کا تقاضا ہے تو اسے تفریط زر کی صورت میں بھی اختیار کیا جائے۔

❀...... اشاریہ سے قیمتوں کا تعین صرف ایک اندازہ اور تخمینہ ہوتا ہے جب کہ قرض کی واپسی کو اندازے اور تخمینے سے مشروط کرنا جائز نہیں۔

یہی وہ خرابیاں ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ شرعی اعتبار سے قرضوں کی اشاریہ بندی کی سکیم قابل عمل نہیں۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اسے خلاف شرع قرار دیا ہے، دیکھئے ''رپورٹ بلا سود بنکاری'' ص:۲۲

اس کے علاوہ اگر معاشی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اشاریہ بندی کی سکیم بے فائدہ ہے۔ کیوں کہ یہ طے شدہ ہے کہ تمام شعبوں میں نفع پذیری کی شرح یکساں نہیں ہوتی۔ جن شعبوں میں تو منافع کی شرح عمومی سطح کی قیمتوں کے اضافے کے برابر یا زائد ہوگی وہ فائدے میں رہیں گے لیکن وہ شعبے جہاں قیمتوں میں اضافہ کے تناسب سے نفع حاصل نہیں ہوتا خسارے میں رہیں گے جیسے صنعتی شعبہ ہے یہاں بعض حالات میں عمومی سطح کے افراط زر کی شرح کے تناسب سے نفع نہیں ہوتا۔ اسی طرح زراعت کا شعبہ بھی متاثر ہوسکتا ہے کیوں کہ زرعی اجناس کی قیمتیں بالعموم حکومت خود طے کرتی ہے یا پھر بین الاقوامی طلب ورسد کی بنیاد پر طے ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر افراط زر کی شرح منافع کی شرح سے زائد ہوگی تو اشاریہ بندی کی وجہ سے شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی بھی حوصلہ شکنی ہوگی۔

بلکہ بعض ماہرین معیشت کے نزدیک اشاریہ بندی ایک طرح سے خود اپنے جلو میں افراطِ زر لے کر آتی ہے اور اس سے افراطِ زر کا ایک خود کار نظام جنم لیتا ہے یہی وجہ ہے جن ممالک نے یہ سکیم اختیار کی وہاں افراطِ زر کی شرح میں اضافہ تو ہوا ہے کمی واقع نہیں ہوئی۔

اسی طرح نظری لحاظ سے بھی اشاریہ بندی کی سکیم غلط ہے کیوں کہ اشیاء وخدمات کی قیمتوں کا تعین زر کرتا ہے لیکن اشاریہ بندی میں دونوں ایک دوسرے کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ یعنی زر کی قیمت کا تعین اشیاء وخدمات اور اشیاء خدمات کی قیمتوں کا تعین زر کرتا ہے۔

## امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول سے غلط استدلال:

اشاریہ بندی کے قائلین کی رائے میں دھاتی سکوں (فلوس) کے بارہ میں حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا نقطہ نظر اشاریہ بندی سے ملتا جلتا ہے۔

اس کی توضیح یوں ہے کہ جب دھاتی سکوں کے ذریعے کوئی چیز ادھار خریدی جائے یا کسی کو یہ سکے قرض دیئے جائیں اور پھر ادائیگی سے قبل سکوں کی قیمت کم ہو جائے تو جمہور فقہاء جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں کے نزدیک جتنے سکے بطور قیمت بائع کے ذمے واجب ہوئے تھے یا جتنے سکے قرض گیرنے لیے تھے اتنے ہی واپس کرنے ہوں گے۔ سکوں کی قوت خرید کی بیشی کی وجہ سے ان کی تعداد میں کمی بیشی نہیں ہوگی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سکے اموال مثلیہ میں شامل ہیں اور اموال مثلیہ میں مقدار کا خیال رکھا جاتا ہے نہ کہ قیمت ومالیت کا۔

اس کے برعکس امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ادائیگی سکوں کی قیمت میں کمی بیشی ملحوظ رکھ کر کی جائے گی۔ ان کا موقف یہ ہے کہ مذکورہ سکے دراصل دراہم کی ریزگاری ہے۔ دس سکے ایک درہم کے مساوی ہیں یعنی ایک سکہ درہم کا دسواں حصہ ہے۔ تو دس سکے قرض لینے کا

مطلب ایک درہم قرض لینا ہے۔ اب اگر ادائیگی سے قبل سکے کی درہم کے ساتھ نسبت تبدیل ہو جائے مثلاً ایک درہم میں گیارہ سکے قرار دے دیئے جائیں جس کو اصطلاح میں سکہ کی قیمت میں کمی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس صورت میں گیارہ سکے دینے کا معنی ہوگا کہ پورا درہم واپس کیا گیا ہے۔ جب کہ دس سکے واپس کرنے کا مطلب ہوگا کہ درہم کا دسواں حصہ کم کر دیا گیا ہے۔لہٰذا گیارہ سکے واپس کیے جائیں گے۔

اس سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک کرنسی کی قوتِ خرید میں کمی کا ازالہ مقروض کی ذمہ داری ہے۔

لیکن اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے مذکورہ موقف سے یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مالی واجبات میں کرنسی کی گرانی وارزانی کو پیش نظر رکھنے کے قائل ہیں۔

①......ایک تو اس لیے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے تو صرف ایک واقعاتی صورت کا حل بتایا ہے کہ اگر اس قسم کا معاملہ پیش آجائے تو یوں تصفیہ کر لیا جائے۔ان کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ بائع یا قرض گیر معاہدے کے وقت پیشگی یہ شرط لگالیں۔ جب کہ اشاریہ بندی کے حامی تو کہتے ہیں کہ اسے بطور نظام نافذ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے یہ ان حضرات کی اپنی رائے ہے، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی یہ مراد ہرگز نہیں ہے۔

②...... دوسرا اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ سکے درہم کی ریزگاری ہیں۔ اور سکے قرض لینے کا مطلب درحقیقت درہم قرض لینا ہے۔لہٰذا درہم کے ساتھ ان کی نسبت تبدیل ہونے پر اتنے سکے ادا کیے جائیں گے جو درہم کی مالیت کے برابر ہوں۔لیکن مروّجہ کرنسی دھاتی سکوں سے بالکل مختلف ہے یہ کسی کرنسی کی ریزگاری نہیں بلکہ سونے چاندی کی مانند خود مستقل کرنسی ہے اس لیے کرنسی نوٹوں کو ان پر قیاس کرنا درست نہیں۔

فائدہ: دھاتی سکے دراہم کی ریزگاری ہیں اور ان کی قیمت کم ہونے کا معنی درہم کے ساتھ ان کی نسبت بدل جانا ہے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ ابن الہمام (متوفی ۸۱۵ھ) نے اپنے رسالہ ''نزہۃ النفوس فی بیان حکم التعامل بالفلوس'' کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے کہ پہلے قدس شریف میں ایک درہم میں ۸۰ سکے ہوتے تھے۔ بعد میں ۹۶ کر دیئے گئے یوں سکوں کی قیمت کم ہوگئی پھر اس میں مزید تبدیلیاں آتی رہیں۔ چناں چہ لوگ اپنے معاملات کے حوالے سے شدید پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔

اس کے علاوہ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ جس طرح سکوں کی قیمت میں کمی کا اعتبار کرتے ہیں اس طرح اضافے کا بھی اعتبار کرتے ہیں۔مگر اشاریہ بندی صرف اسی وقت عمل میں لائی جاتی ہے جب اشیاء کی قیمتیں بڑھ رہی ہوں کمی کی صورت میں آنکھیں بند کر لی جاتی ہیں۔ کیوں کہ اس صورت میں کوئی شخص اپنی قرض دی گئی رقم سے کم قبول کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ اگر امام ابو یوسفؒ کے قول کو ہی دلیل بنانا ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ اس پر دونوں صورتوں میں عمل کیا جائے۔

**خلاصہ کلام:**

مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے:

❀......زر کے انتخاب میں سونے، چاندی کی شرط نہیں ہے۔

❀......اجراء زر صرف حکومت کا حق ہے۔

❀......کرنسی کی قدر معقول حد تک مستحکم ہونی چاہیے۔ جدید ماہرین معیشت کے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت اشیاء وخدمات کی موجودہ یا متوقع پیداوار کی مالیت سے زائد کرنسی جاری نہ کرے۔

❀......کاغذی کرنسی سونے چاندی کی طرح مستقل زر ہے۔

❀......جب کسی کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی کی مالیت کے برابر نوٹ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

❀......مختلف ممالک کی کرنسیوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ درست ہے بشرطے کہ کسی جانب سے ادائیگی ادھار نہ ہو۔لیکن ایک ملک کے یکساں مالیت کے کرنسی نوٹوں کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ ناجائز ہے۔

❀......قرضوں کی اشاریہ بندی خلاف شریعت ہے۔

❀❀............❀............❀❀

# اپریل فول کی حقیقت

محمد اشتیاق شاہد، سیالکوٹ

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ پیغمبر دو عالم ﷺ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انھوں نے دین کو ناقص نہیں چھوڑا، بلکہ جو انھیں اللہ جل جلالہ کی جانب سے پیغام ملا، مکمل لوگوں تک پہنچا دیا اور اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانا ان کا فرض تھا۔ اس لیے کہ انھیں اللہ کی جانب سے حکم ملا تھا:

﴿ یایھا الرسول بلغ ما أنزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالته ﴾ [المائدة: ٦٧]

''اے (اللہ کے) رسول ﷺ! جو آپ پر آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجیے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔''

یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ رحمت دو عالم ﷺ نے پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچا کے رسالت کا حق ادا کر دیا ہے۔ گویا دین اسلام میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب اگر ہم دین سے کوئی چیز نکالتے ہیں تو اس میں نقص پیدا کرنے کا جرم ہم پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس میں مزید کوئی چیز داخل کرتے ہیں تو اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ...... معاذ اللہ...... رسول اللہ ﷺ نے منصب رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ اسی لیے امام دار الہجرۃ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

"من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنةً فقد زعم أن محمداً فان الرسالة لأن الله تعالٰی يقول: ﴿ الیوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا ﴾ ۔" [اصول البدع والسنن]

''جس نے دین میں کوئی نیا کام ایجاد کیا اور اسے اچھا سمجھا اس نے یہ گمان کیا کہ حضرت محمد ﷺ نے رسالت میں خیانت کی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر کے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمالیا۔''

معلوم یہ ہوا کہ جتنا دین ہمیں پیارے پیغمبر ﷺ دے گئے ہیں صرف اتنے پر ہی عمل کرنے سے انسان جنت کا حق دار بن جاتا ہے۔

محترم قارئین! اسلام نے خوشی کے دن بھی متعین فرما دیئے ہیں اور غم کے مواقع کی نشان دہی بھی کر دی ہے۔ اسلام کے متعین کردہ خوشی کے دنوں کے علاوہ اگر کوئی مزید دن مقرر کر کے اسے اسلام پہ چسپاں کرتا ہے اور خوشی منانے کے لیے غیر شرعی طریقے اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کے ہاں بھی جواب دہ ہے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا جرم بھی اس پر عائد ہوتا ہے۔

ایسے ہی غربی تہذیب نے امت مسلمہ کی نسل نو کو مکروہات کے جو تحائف دیئے اور ہماری روشن خیال حکومتوں نے انھیں اپنے ماتھے کی زینت بنانے اور آقایانِ مغرب کی بے سوچی سمجھی تقلید کے شوق نے ہمارے معاشرے میں جن رسموں کو رواج دیا، انہی میں سے ایک رسم اپریل فول منانے کی رسم بھی ہے۔ اس رسم کے تحت یکم اپریل کی تاریخ میں جھوٹ بول کر کسی کو دھوکا دینا، اور دھوکا دے کر اسے بے وقوف بنانا نہ صرف جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ اسے ایک کمال قرار دیا جاتا ہے۔ جو شخص جتنی صفائی اور چابک دستی سے دوسرے کو جتنا بڑا دھوکا دے، اتنا ہی اسے قابل تعریف اور یکم اپریل کی تاریخ سے صحیح فائدہ اٹھانے والا سمجھا جاتا ہے۔

یہ مذاق جسے درحقیقت ''بدمذاقی'' کہنا چاہیے نہ جانے کتنے افراد کو بلاوجہ جانی اور مالی نقصان پہنچا چکا ہے بلکہ اس کے نتیجے میں بعض

اوقات لوگوں کی جانیں چلی گئی ہیں کہ انھیں کسی ایسے صدمے کی جھوٹی خبر سنادی گئی جسے سننے کی وہ تاب نہ لا سکے اور زندگی ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

یہ رسم جس کی بنیاد جھوٹ، دھوکے اور کسی بے گناہ کو بلاوجہ بیوقوف بنانے پر ہے، اخلاقی اعتبار سے تو جیسی کچھ ہے ظاہر ہی ہے۔ لیکن اس کا تاریخی پہلو بھی ان لوگوں کے لیے انتہائی شرمناک ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تقدس پر کسی بھی اعتبار سے ایمان رکھتے ہیں۔

اس رسم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس بارے میں مؤرخین کے بیانات مختلف ہیں، بعض مصنّفین کا کہنا ہے کہ فرانس میں سترھویں صدی سے پہلے سال کا آغاز جنوری کے بجائے اپریل سے ہوا کرتا تھا۔ اس مہینے کو رومی لوگ اپنی دیوی وینس (Venus) کی طرف منسوب کر کے مقدس سمجھا کرتے تھے۔ وینس کا ترجمہ یونانی زبان میں Aphrodite کیا جاتا تھا۔ اور شاید اسی یونانی نام سے مشتق کر کے نام اپریل رکھ دیا گیا۔

[بونا نیکا پندرھواں ایڈیشن، ص:۲۹۲، ج:۸]

لہٰذا بعض مصنّفین کا کہنا یہ ہے کہ چوں کہ یکم اپریل سال کی پہلی تاریخ ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ایک بت پرستانہ تقدس بھی وابستہ تھا، اس لیے اس دن کو لوگ جشنِ مسرت منایا کرتے تھے اور اسی جشنِ مسرت کا ایک حصہ ہنسی مذاق بھی تھا جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپریل فول کی شکل اختیار کر گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس جشنِ مسرت کے دن لوگ ایک دوسرے کو تحفے دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی نے تحفے کے نام پر کوئی مذاق کیا جو بالآخر دوسرے لوگوں میں بھی رواج پکڑ گیا۔

برٹانیکا میں اس رسم کی ایک اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ۲۱ مارچ سے موسم میں تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کو بعض لوگوں نے اس طرح تعبیر کیا کہ...... معاذ اللہ...... قدرت ہمارے ساتھ مذاق کر کے ہمیں بے وقوف بنا رہی ہے۔ لہٰذا لوگوں نے بھی اس زمانے میں ایک دوسرے کو بے وقوف بنانا شروع کر دیا۔ [برٹانیکا، ص:۴۹۶، ج:۱]

یہ بات اب بھی مبہم ہی ہے کہ قدرت کے اس نام نہاد ''مذاق'' کے نتیجے میں یہ رسم چلانے سے ''قدرت'' کی پیروی مقصود تھی یا اس سے انتقام لینا منظور تھا؟

ایک تیسری وجہ انیسویں صدی عیسوی کی معروف انسائیکلو پیڈیا ''لاروس'' نے بیان کی ہے، اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے وہ وجہ یہ ہے کہ دراصل یہودیوں اور عیسائیوں کی بیان کردہ روایات کے مطابق یکم اپریل وہ تاریخ ہے جس میں رومیوں اور یہودیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمسخر اور استہزاء کا نشانہ بنایا گیا، موجودہ نام نہاد انجیلوں میں اس واقعے کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ لوقا کی انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

''اور جو آدمی اسے (یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو) گرفتار کیے ہوئے تھے اس کو ٹھٹھے میں اڑاتے اور مارتے تھے۔ اور اس کی آنکھیں بند کر کے اس کے منہ پر طمانچے مارتے تھے، اور اس سے یہ کہہ کر پوچھتے تھے کہ نبوت (یعنی الہام) سے بتا کہ کس نے تجھ کو مارا؟ اور طعنے مار مار کر بہت سی اور باتیں اس کے خلاف کہیں۔'' [لوقا:۲۲/۶۳ تا ۶۵]

انجیلوں میں ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کو یہودی سرداروں اور فقیہوں کی عدالت عالیہ میں پیش کیا گیا۔ پھر وہ انھیں پیلاطس کی عدالت میں لے گئے کہ ان کا فیصلہ وہاں ہوگا۔ پھر پیلاطس نے انھیں ہیروڈیس کی عدالت میں بھیج دیا اور بالآخر ہیروڈیس نے دوبارہ فیصلے کے لیے ان کو پیلاطس ہی کی عدالت میں بھیجا۔ لاروس کا کہنا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک عدالت سے دوسری عدالت میں بھیجنے کا مقصد بھی ان کے ساتھ مذاق کرنا، اور انھیں تکلیف پہنچانا تھا۔ اور چوں کہ یہ واقعہ یکم اپریل کو پیش آیا تھا اس لیے اپریل فول کی رسم درحقیقت اسی شرمناک واقعے کی یادگار ہے۔

اپریل فول منانے کے نتیجے میں جس شخص کو بیوقوف بنایا جاتا ہے، اسے فرانسیسی زبان میں Poisson darril کہا جاتا ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ April Fish ہے یعنی اپریل کی مچھلی۔

[برٹانیکا، ص:۴۹۶، ج:۱]

گویا جس شخص کو بیوقوف بنایا گیا ہے وہ پہلی مچھلی ہے جو اپریل کے آغاز میں شکار کی گئی۔ لیکن لاروس نے اپنے مذکورہ بالا موقف کی تائید میں کہا ہے کہ Poisson کا لفظ جس کا ترجمہ ''مچھلی'' کیا گیا ہے درحقیقت اسی سے ملتے جلتے ایک اور فرانسیسی لفظ Posion کی بگڑی

ہوئی شکل ہے جس کے معنی ''تکلیف پہنچانے'' اور ''عذاب دینے'' کے ہوتے ہیں۔لہٰذا یہ رسم درحقیقت اس عذاب اور اذیت کی یاد دلانے کے لیے مقرر کی گئی ہے جو عیسائی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پہنچائی گئی تھی۔

ایک اور فرانسیسی مصنف کا کہنا ہے کہ دراصل Poisson کا لفظ اپنی اصل شکل ہی پر ہے لیکن یہ لفظ پانچ الفاظ کے ابتدائی حروف کو ملا کر ترتیب دیا گیا ہے جن کے معنی فرانسیسی زبان میں بالترتیب عیسیٰ علیہ السلام، مسیح، اللہ، بیٹا اور فدیہ ہوتے ہیں۔اس تفصیل کے لیے دیکھئے فرید وجدی کی عربی انسائیکلوپیڈیا، دائرہ معارف القرآن، ص:۲۱-۲۲، ج:۱۔

گویا اس مصنف کے نزدیک بھی اپریل فول کی اصل یہی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذاق اڑاتے اور انھیں تکلیف پہنچانے کی یادگار ہے۔اگر یہ بات درست ہے (لاروس وغیرہ نے اسے بڑے وثوق کے ساتھ درست قرار دیا ہے اور اس کے شواہد پیش کیے ہیں) تو غالب گمان یہی ہے کہ یہ رسم یہودیوں نے جاری کی ہوگی، اور اس کا منشا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تضحیک ہوگی۔لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جو رسم یہودیوں نے (معاذ اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہنسی اڑانے کے لیے جاری کی اسے عیسائیوں نے کسی طرح ٹھنڈے پیٹوں نہ صرف قبول کر لیا بلکہ خود بھی اسے منانے اور رواج دینے میں شریک ہو گئے۔

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عیسائی صاحبان اس رسم کی اصلیت سے واقف ہی نہ ہوں اور انھوں نے بے سوچے سمجھے اس پر عمل شروع کر دیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عیسائیوں کا مزاج و مذاق اس معاملے میں عجیب و غریب ہے۔جس صلیب پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کے خیال میں سولی دی گئی بظاہر قاعدے سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان کی نگاہ میں قابل نفرت ہوتی کہ اس کے ذریعے حضرت مسیح علیہ السلام کو ایسی اذیت دی گئی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عیسائی حضرات نے اسے مقدس قرار دینا شروع کر دیا اور آج وہ عیسائی مذہب میں تقدس کی سب سے بڑی علامت سمجھی جاتی ہے۔

لیکن مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ خواہ اپریل فول کی رسم وینس نامی دیوی کی طرف منسوب ہو، یا اسے (معاذ اللہ) قدرت کے مذاق کا ردّعمل کہا جائے یا حضرت مسیح علیہ السلام کے مذاق اڑانے کی یادگار، ہر صورت میں اس رسم کا رشتہ کسی نہ کسی توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے یا واقعے سے جڑا ہوا ہے اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ رسم مندرجہ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے۔

① ...... جھوٹ بولنا، ② ...... دھوکا دینا، ③ ...... دوسرے کو اذیت دینا، ④ ...... ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے یا توہم پرستی، یا پھر ایک پیغمبر کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔

اب امت مسلمہ کو خود فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر اسے فروغ دیا جائے؟

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ ہیں مسلماں جنھیں دیکھ کر شرمائیں یہود

﴿ اللهم اهد قومی فانهم قوم لا یعلمون ﴾



# حلال اشیاء پر خرچ کرنے کی ترغیب اور شکر الٰہی

محترمہ سعدیہ گلزار، طالبہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب لاہور

مغربی معیشت میں لوگ آزاد ہیں سرمایہ دارانہ ذہنیت کے زیر اثر ذاتی مفاد ہی ان کا مقصد حیات ہے۔ اس معیشت میں ہر شخص کو آزادی ہے، جو چیز چاہے طلب کرے اور جتنا چاہے صرف کرے اس کے برعکس اسلام نے کچھ حدود قیود مقرر کیے ہیں۔ ان حدود قیود کے اندر رہتے ہوئے ہم دولت خرچ کر سکتے ہیں۔ اسلام ہمیں ایسی زندگی گزارنے کی ترغیب دیتا ہے جس میں اخلاقیات اور مادیت کا امتزاج ہو۔

اسلام انسان کو اس بات کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ اپنی مرضی سے ناجائز طریقوں سے دولت کمائے اور خرچ کرے، اسلام زندگی کی روحانی و مادی دونوں بنیادوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے اور خرچ کرتے ہوئے حلال رزق خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾

"اے لوگو! ہم نے جو تم کو حلال رزق دیا ہے اس سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔" [البقرة ٢ : ١٦٨]

فخر الدین رازی (م ۶۰۴ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿ حلالا طيبا ﴾ طیب سے مراد پاکیزہ چیزیں ہیں جب کہ یہاں حلال وحرام کو متضاد کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے۔ طیب میں ہر حلال شے کو مستحب طریق سے پانے اور مستفید ہونے کا مفہوم آجاتا ہے۔ جس شے سے نفس کراہت کرے وہ حرام، اور شرعاً ممانعت فرمائی۔ آیت ہذا میں طیب سے مراد دو باتیں ہیں:

اوّل: اس سے مراد نفس کا اطمینان وراحت ہے۔ جو حلال شے کو پاک طریق سے پا کر ملتا ہے وگرنہ اگر یہ حلال کے مترادف کے طور پر لیا جائے تو محض تکرار بحث تھا جو عبث تھا۔

ثانی: اس سے مراد مباح ہے لیکن اگر اس مفہوم میں لے لیا جائے تو یہ حلال کے مترادف کے طور پر ہے جب کہ کسی بھی حلال شے کو ظلماً حاصل کرنا حرام ہے اور جائز طریقے سے لینا مباح ہے۔ [التفسير الكبير أو مفاتيح الغيب۔ دار الكتب العلميه بيروت (لبنان)، ١٤٢٥ھ، ٣/٧۔ ٣۔٤]

مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

﴿ حلالا طيبا ﴾ اس لفظ کے اصل معنی گرہ کھولنے کے ہیں۔ جو چیز انسان کے لیے حلال کر دی گئی گویا ایک گرہ کھول دی گئی اور لفظ طیب کے معنی ہیں پاکیزہ جس میں شرعی حلال ہونا بھی داخل ہوا اور طبعی مرغوب ہونا بھی۔ [معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی: ۱۴۲۲ھ، ۱/۳۵۵]

" واصلحوا اموالكم التى رزقكم الله والقليل فى رفق خير من كثير ۔" [طبری، (م ٣١٠ھ)، من تاريخ الامم والملوك، مطبعة الاستقامة، قاهره: ١٣٥٧ھ، ٣/ ٢٨٣]

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ حلال جو اللہ نے تمھیں رزق کے طور پر عطا کیا ہو وہ درست اور اچھا ہونا چاہیے۔ کم مقدار جو نرمی سے حاصل کی جائے اس کثیر مقدار سے بہتر ہے جو سختی سے حاصل کی جائے۔ سید قطب شہید رحمہ اللہ (م ۱۹۶۶ء) لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اعلان فرماتے ہیں کہ زمین میں جو حلال اور پاک

چیزیں ہیں انھیں کھاؤ، سوائے ان کے جنھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔ حرام وحلال کے تعین میں صرف اللہ تعالیٰ سے راہ نمائی حاصل کرو اور ان معاملات میں شیطان کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ نیکی کا حکم ہرگز نہیں دے گا غلط تصورات کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان خود اپنی مرضی سے بعض چیزوں کو حلال قرار دے اور بعض کو حرام حالاں کہ اس پر اللہ کی جانب سے کوئی دلیل وسند نہ ہو۔ [فی ظلال القرآن، دار الشروق بیروت (لبنان) ١٩٧٤ء، ١/ ١٥٥؛ امرتسری، محمد ثناء الله، عثمانی، بیان القرآن المسمّٰی تفسیر المظهری، مجلس اشاعت العلوم الکابن: ١/ ١١٦٥]

محمد محمود حجازی رحمہ اللہ ''الفحشا'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

حلال کو چھوڑ کر حرام کی طرف راغب ہونا عقلی اور شرعی دونوں لحاظ سے ناپسندیدہ ہے۔ [التفسیر الواضح، الاستقلال الکبری، قاهرة: ١٩٢٤، ١/١١/١٦]

انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی حلال رزق کھانے کی تلقین کی گئی ہے۔

﴿ يَاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴾ [المومنون٢٣: ٥١]

''اے اللہ کے پیامبرو! کھاؤ پاکیزہ رزق اور نیک عمل کرو بے شک جو تم کرتے ہو اللہ جاننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کو رزق فراہم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے لذیذ اور مرغوب اشیاء جو انسان کے جسم کے لیے روحانی طور پر بھی فائدہ مند ہیں حلال ٹھہرائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ہی حلال کو حلال، حرام کو حرام ٹھہرانے کا حق حاصل ہے۔ انسان کا فرض ہے جو اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کے اصول عائد کیے ہیں ان پر ہی عمل پیرا رہے۔

حلال اشیاء کا استعمال اور ''شکر الٰہی'' کی ترغیب دی گئی ہے۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴾ [البقرة٢: ١٧٢]

''اے لوگو جو ایمان لائے کھاؤ پاکیزہ رزق میں سے جو ہم نے تم کو دیا اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم عبادت کرتے ہو۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پاک اشیاء فراہم کی ہیں۔ انسان کو حکم ہے وہ صرف حلال اور پاکیزہ اشیاء کا استعمال کرے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر بجالائے۔

ابوحیان الغرناطی (م ۷۴۵ھ) لکھتے ہیں:

انسان کو اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کا اس بات پر شکر ادا کرنا چاہیے کہ پاکیزہ اشیاء کو انسانوں کے لیے حلال ٹھہرایا۔ [البحر المحیط، دار الفکر، بیروت (لبنان)، ٦٢- ١٤٢٥ھ، ٢/ ١١٠؛ فی ظلال القرآن: ١/ ١٥٦؛ التفسیر الواضح: ١/ ١١/ ١٨]

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ o وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴾ [المائدة٥: ٨٧،٨٨]

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ کرو اور نہ حد سے آگے بڑھو، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ ستھری اور حلال چیزیں جو بھی اللہ تعالیٰ نے تمھیں دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ پیو اور اس اللہ سے ڈرتے رہا کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔''

فخر الدین رازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جو اللہ تعالیٰ نے حلال ٹھہرایا ہے اس کو حرام ٹھہرانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قول کئی معنی کا احتمال رکھتا ہے:

اوّل: تم عقیدہ نہ رکھو ان چیزوں کی حرمت کا جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں۔

دوم: جو چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں ان کی حرمت کا زبان سے اظہار نہ کرو۔

سوم: تم حرام چیزوں سے بچنے کی طرح ان سے بچو۔ یہ تین معنی

عقیدے، قول اور عمل پر مشتمل ہیں۔

چہارم: تم فتوے کے ذریعے کسی پر حلال چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ۔

پنجم: تم نذر یا قسم کے ذریعے ان کی حرمت کو لازم نہ ٹھہراؤ اور آیت کی مثال اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ''اے نبی ﷺ جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے اس کو تم حرام کیوں ٹھہراتے ہو۔''

ششم: کہ کوئی غصب شدہ چیز کو اپنی چیز کے ساتھ اس طرح ملائے کہ اس میں تمیز ممکن نہ رہے تو اس وقت وہ تمام حرام ہو جائے گی۔ تو یہ ملانا اس کے لیے حلال چیز کی حرمت کا سبب ہوگا۔ یہی حکم اس وقت ہوگا جب نجس کو طاہر کے ساتھ ملایا جائے اور آیت ان تمام معنی پر مشتمل ہے اور ان تمام معنی پر اس کا مشتمل ہونا بعید نہیں ہے۔

[مفاتیح الغیب: ۶/xii/۶۰]

امین احسن اصلاحی کے نزدیک: اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو انسان کے لیے جائز قرار دیا ہے، انسان کو آزادی ہے کہ وہ مال بقدر کفایت استعمال کرے اور حد سے آگے نہ بڑھے۔

[تدبر قرآن، دارالاشاعۃ الاسلامیہ، لاہور: ۱۳۹۱ھ، ۲/ ۳۵۹]

شریعت میں حلال کے استعمال کو چھوڑنے کی ممانعت ہے اس کے بارے میں مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''حلال چیز کو بلا عذر ثواب سمجھ کر چھوڑ دے، جس کو ناواقف آدمی تقویٰ سمجھتا ہے، اللہ کے نزدیک تعدی اور ناجائز ہے۔''

[معارف القرآن: ۳/ ۲۲۱]

اگر انسان حلال رزق کو اپنائے تو فضائل اخلاق انسان کی شخصیت کا لازمی حصہ بن جاتے ہیں۔ ورنہ انسانی ڈھانچہ برے اخلاق کا منبع بن جاتا ہے۔

⊙...... اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بھی پاکیزہ اور حلال اشیاء کے استعمال کا حکم دیا ہے۔

⊙...... اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے فائدے کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال فرمائی ہیں جو انسان کی جسمانی اور روحانی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔

⊙...... حلال کو حلال اور حرام کو حرام ٹھہرانے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ بنی نوع انسان کو شیطان کی پیروی کرنے سے منع کیا گیا ہے کیوں کہ شیطان کی پیروی سے مراد برے راستہ کی ترغیب ہے جو وہ انسان کو دیتا ہے، کہ وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرائے۔ حالاں کہ حلال وحرام کا قطعاً حق اللہ کے پاس ہے۔

⊙...... انسان کو حکم ہے حلال اشیاء کا استعمال کرے اور ربّ کائنات کی بے شمار نعمتوں کا شکر بجالائے۔ اس بات کا بھی کہ اس نے انسان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں۔

⊙...... فرمانِ الٰہی ہے کہ اللہ کی محبت اور اطاعت میں پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ۔ اس کی نافرمانی اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے الگ رہو، حلال وحرام کی پیروی میں ربّ کائنات کا حکم مانو۔



# خاندان سعادت قصور اور مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ ①

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

حضرت استاذی ومخدومی مولانا غلام رسول مہر رحمہ اللہ نے خاندان سعادت قصور کے گل سر سید حضرت مولانا عبدالقادر قصوری اور ان کے صاحب زادۂ معظم مولانا محی الدین قصوری کے نام خطوط مرتب کیے تھے اوران پر ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ مفید حواشی بھی تحریر فرمائے تھے۔ یہ خطوط تبرکاتِ آزاد کا سب سے اہم حصہ ہیں۔

درحقیقت مولانا مہر نے ''تبرکات'' انھیں کو قرار دیا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے خطوط اس مجموعے کی زینت میں اضافے کے لیے تھے۔ اصحابِ ذوق ونظر کو معلوم تھا کہ ان دونوں بزرگوں کے نام مولانا کے خطوط کئی بار جرائد میں شائع ہو چکے تھے! اور خانوادۂ قصور کے دونوں بزرگوں کے نام خطوط پہلی بار شائع کیے جا رہے تھے۔ اس لیے تبرک کی حیثیت انھیں کو حاصل تھی۔ اور دوسرے پہلو سے بھی یہ خطوط اپنا ایک امتیاز رکھتے تھے۔

''برکاتِ آزاد'' میں مولانا آزاد کا ایک طویل اور اہم خط جو سورۂ یوسف کے بعض اشکال کے بارے میں مولانا محی الدین احمد قصوری کے سوالات کے جواب میں تھا۔ یہ خط تبرکات میں شامل نہیں ہوسکا۔ نیز چند خطوط مولانا قصوری نے ایک پبلشر کو اشاعت کے لیے دیے تھے جن کے ساتھ ان کے اپنے قلم سے بعض نہایت قیمتی تحریریں تھیں اور ان کا محفوظ ہو جانا نہایت ضروری تھا تبرکات میں وہ بھی نظر انداز ہوگئی تھیں۔ اب ان خطوط کی اشاعت کا جو انتظام کیا گیا ہے اس میں نہ صرف مذکورہ بالا تفسیری خط بلکہ مکتوب الیہ کے قلم سے یادگار تحریروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

مولانا محی الدین احمد کے نام حضرت مولانا کے خطوط میں خاندان کے جن افراد کے نام سلام دعا اور عیادت پرسی کے سلسلے میں آئے ہیں یا کسی اور حوالے سے خاندان کے کسی فرد کا ذکر آیا تھا اس کا تعارف بھی نہیں ہوا تھا، اب ان پر بھی ضروری حواشی لکھ دیے ہیں۔ لیکن ان کی تالیف کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ خطوط کی ترتیب کے بعد سربراہ خاندان کے ساتھ بہ ترتیب خاندان کے افراد کا تذکرہ بھی مرتب کر دیا ہے اور اس طرح کہ شجرۂ خاندان کے گل دستے میں جس شاخ اور پھول پتی کی رشتے کے لحاظ سے جو قدرتی جگہ تھی اس کو اس کی وہی قرار واقعی جگہ دی گئی ہے۔ اگر یہ حواشی خطوط کے پچاس صفحات میں الگ الگ دیے جاتے تو ان کا وہ حسن جو اس گلدستے کی شکل میں نمایاں ہوا ہے وہ ظاہر نہ ہوتا۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس انداز کو پسند فرمائیں گے۔

اگرچہ اس خانوادۂ سعادت کے ایک دور افتادہ نیاز مند کا یہ مقام نہیں کہ وہ اس کے خصائص وامتیاز کے بیان میں قلم اٹھائے لیکن سوچا کہ اس وقت ذوق واستعداد سے محروم اس تہی دامن کو کام کا ابتدائی نمونہ پیش کر دینا چاہیے۔ امید ہے کہ آئندہ اس اختلاف کی تاریخ ودرایات اور خصوصیات سے زیادہ واقف اہل علم قلم اٹھائیں گے اور اس علمی ودینی کام کو اس کے شایانِ شان انجام دیں گے۔ اور کیا تعجب کہ اخلاف خاندان ہی میں سے خدا کسی فاضل کو اس کی توفیق دے کہ وہی اپنے خاندان رفیع الذکر کا ایک مکمل اور جامع الاطراف تذکرہ مرتب کر دے کہ یہ اسی کا حق ہے اور اسی کو زیب دے گا۔ خاک سار تو اس خاندان عظیم الشان کے اخلاف کو اس طرف توجہ دلائے گا کہ ان پر اپنے خاندان کے موروثی خصائص وامتیازات کو برقرار رکھنے کی جو ذمہ داریاں ہیں، وہ انھیں فراموش نہیں کر دینی چاہئیں۔ [ا،س،ش]

## مولانا عبدالقادر قصوری:

یہ بزرگ خاندان سعادت قصور کے سربراہ اور گل سرسید تھے۔ ان کے وجود گرامی اور قامت ستودہ صفات نے اپنے اسلاف کو تاریخ علم وتہذیب اور دعوت توحید و کتاب وسنت کا حصہ بنادیا اور ان کے نیک نام کو روشن کیا اور اخلاف کی تعلیم وتربیت سے اس دور میں انھیں قوم وملت کی رہنمائی کے مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ اپنے اسلاف کے جانشین اور اخلاف کے قابل فخر بزرگ تھے۔ ان کے خاندان کا شمار دین کے خدمت گزار گھرانوں میں ہوتا ہے۔ ان کے دادا پردادا اپنے دور کے نام ور علمائے دین میں سے تھے۔

ان کے والد گرامی مولانا غلام احمد خاندان کے پہلے شخص تھے جو کتاب وسنت کے سرچشمہ حیات سے سیراب اور جام توحید کے لذت شناس اور سلف صالحین کے جادۂ قدیمہ پر گام زن ہوئے تھے۔ ان کے کلام میں ایسی تاثیر اور سیرت میں قدرت نے ایسی کشش پیدا کردی تھی کہ ایک عالم کو انھوں نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اور ان کی اولاد واخلاف کے قلوب میں بھی اس تاثیر کی ایسی تخم ریزی ہوئی اور اس کا اثر ان کی روح وجسم میں ایسا سرایت کرگیا کہ پونے دوسو برس کی تاریخ میں اس خانوادۂ سعادت کے کسی فرد کو صحت وعیش اور رنج والم کی کسی حالت میں کتاب وسنت کے دارالصحت کے سوا کسی اور دار العلاج سے رجوع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ ہر فرد اسی جام توحید کی صفت اور تمسک بالکتاب والسنہ کے سرور اور کیف سے سرشار ہے۔

اولاً ان کا خاندان اورنگ آباد ضلع سیال کوٹ سے آکر موضع دلاور چیمہ (تحصیل وزیرآباد ضلع گوجراں والا) میں آباد ہوا تھا۔ مولانا عبدالقادر ۱۸۶۳ء میں اسی موضع (دلاور چیمہ) میں پیدا ہوئے۔ گھر کے بزرگوں سے اردو، عربی، فارسی کی تعلیم پائی۔ کالج کی پڑھائی کے لیے لاہور کا رخ کیا اور اورنیٹل کالج سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز ہی سے قصور میں پہلے عارضی اور پھر مستقل سکونت اختیار کرلی۔ تاریخ کے دور جدید میں ان کے خاندان کے قیام سے قصور کی نیک نامی اور شہرت میں اضافہ ہوا۔ وہ قصور کا سب سے قدیم اور مال دار جاگیر دار خاندان نہ تھا، لیکن وہ قصور کا بہت محترم اور مہذب خاندان ضرور تھا۔ ان جیسے کسی بھی خاندان کا کسی شہر وقریہ سے منسوب ہونا اس بستی کی عزت وشرف کا موجب ضرور ہوتا۔ قصور سے اس خاندان کی نسبت بلاشبہ اس کی نیک نامی اور شہرت کا موجب ہوتی۔

مولانا عبدالقادر ﷫ پنجاب کے کامیاب وکلا میں اور سیاست میں صف اوّل کی شخصیت شمار ہوتے تھے۔ تحریک مجاہدین سے تو ان کا تعلق بہت زمانے سے تھا۔ ۱۳-۱۹۱۲ء کے بعد ملکی اور قومی تمام تحریکوں میں انھوں نے حریت پسند اور قوم پرور نقطۂ نظر کے مطابق حصہ لیا۔ ملی تحریکات میں مذہبی، تعلیمی، اصلاحی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق دام ودرہم سے امداد کے ساتھ عملی تعاون اور صلاح ومشورے کی راہ سے حصہ لیا۔

وہ اپنی دین داری، شرافت، نیک نفسی، اخلاص وایثار کے لیے پورے پنجاب میں اور اس سے باہر تک قومی وملی حلقوں کی ایک مشہور ومحترم شخصیت تھے۔ ان کی پیشہ ورانہ قابلیت نے ان کی شہرت اور نیک نامی کو دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ قومی وملی خدمات کے سلسلے میں وہ کئی بار قید وبند اور کاروبارِ معیشت کی تباہی کی سخت آزمائشوں سے گزرے۔ ایثارِ وقت ومال، اخلاص وتدبر اور تحمل واستقامت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۲ء میں ان کا تعارف ہوا تھا۔ جلد ہی دونوں بزرگوں میں بہت قریبی اور گہرے تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔ قومی وملی تحریکات میں دونوں بزرگوں کا ایک ہی نقطہ نظر تھا اور فکر ورائے میں ایک دوسرے پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ پھر حضرت قصوری کے چھوٹے بھائی مولوی عبداللہ اور ان کے بیٹوں مولانا محی الدین اور مولانا محمد علی کو مولانا سے عقیدت اور قریبی تعلقات کے ان بزرگوں کے مابین تعلقات اور حد درجہ اعتماد کو اور زیادہ مستحکم کردیا تھا۔ قومی وملی خدمت گزاروں کا یہ خاندان رفیع الارکان اب بھی مولانا آزاد کا عقیدت مند خاندان ہے۔ اس خاندان کے بزرگوں اور فردوں نے تحریک مجاہدین سے لے کر تحریک پاکستان تک تحریک آزادی، تحریک نظم جماعت، تحریک

ریشمی رومال، تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک ہجرت، تحریک تطہیر حجاز، اور دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں میں دل وجان سے حصہ لیا اور خدمت کی راہ میں کبھی کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔

قومی تحریکات میں ۱۹۲۱ء کی شہزادہ ویلز کے استقبال کے بائی کاٹ، ۱۹۲۷ء سائمن کمیشن کے واپس جاؤ کے ہنگامے، ۱۹۲۸ء میں دستور سازی اور نہرو رپورٹ میں ملی مفاد کے تحفظ کی مساعی، ۱۹۳۰ء کی سول نافرمانی، نمک سازی اور یوم آزادی کے اجتماع کی تحریکات، دوسری عالمی جنگ میں حکومت سے عدم تعاون، ستمبر ۱۹۳۹ء میں کرپس مشن کی آمد، ۱۹۴۲ء (اگست) میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں کانگریس اور دوسری قوم پرور جماعتوں اور مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا عبدالقادر اور ان کے خاندان کا مکمل فکری اور عملی تعاون حاصل رہا تھا۔

اور قیامِ پاکستان کے بعد تعمیر وطن کی مساعی، آمریت کے غلبے سے نجات اور جمہوریت کے قیام کی تحریکات میں صف اوّل میں رہ کر اپنا قومی اور ملی فرض ادا کیا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا قصوری رحمہ اللہ نہایت عالی ظرف، متحمل مزاج، وسیع القلب، فراخ حوصلہ، نہایت متخیر، وضع دار، عالم دین، پختہ فکر سیاست داں، شریف النفس، مہذب اور بردبار شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۶ر نومبر ۱۹۴۳ء کی شام کو لاہور میں انتقال ہوا اور قصور میں تدفین عمل میں آئی۔

عبدالحق اور محمد عبداللہ ان کے دو چھوٹے بھائی اور محی الدین احمد، محمد علی، احمد علی اور محمود علی ان کے چار بیٹے تھے۔ سب دین دار، قوم ووطن اور دین وملت کے خدمت گزار، نیک نفس، بلند خیال، کھلے ذہن ودماغ کے مالک اور تعصّبات دینی وسیاسی سے دور ونفور تھے۔ کتاب وسنت کے سب عاشق، اسلاف کے مسلک کے پیرو اور دین کے ذوق وعمل کے سب لذت شناس اور سوسائٹی میں اپنا امتیاز رکھتے تھے۔

**مولانا عبدالقادر قصوری کے بھائی:**

① ...... مولوی عبدالحق مولانا غلام احمد کے منجھلے بیٹے تھے۔ ۱۸۷۰ء اُن کا سالِ پیدائش تھا۔ روایت کے مطابق گھر میں ابتدائی تعلیم سے فراغت کے بعد لاہور کا رخ کیا اور فارسی میں منشی فاضل اور عربی میں مولوی عالم اور قانون میں بی او ایل کے امتحان پاس کیے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد گوجراں والا سے وکالت کا آغاز کیا اور پھر مستقل رہائش بھی وہیں اختیار کر لی۔ قانون میں بڑی دست رس رکھتے تھے۔ خصوصاً دیوانی کے قانون میں ان کی قابلیت مسلم تھی اور بڑے کامیاب وکیل تھے۔

ممتاز بیگم اور فاطمہ بیگم نامی ان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے۔

① مولوی محمد شبلی۔ انھوں نے ٹھیکے داری کے کاروبار کو اپنا ذریعہ معاش بنایا تھا۔

② محمد جنید، جنھوں نے برطانیہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی تھی اور انڈین آرمی میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔

③ ان کے تیسرے بیٹے محمد مسعود نامی تھے۔

فقط یہ چند معلومات عبداللہ ملک کی تالیف ''میاں محمود علی قصوری'' سے اخذ کی ہیں۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب نے ان (مولوی عبدالحق) کے حالات میں اس جملے کا اضافہ کیا ہے کہ انھیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

② ...... مولانا محمد عبداللہ، مولانا عبدالقادر قصوری کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۷۵ء میں دلاور چیمہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں پائی۔ میٹرک کا امتحان وزیر آباد کے ہائی اسکول سے پاس کیا۔ پھر لاہور چلے گئے۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان گورنمنٹ کالج سے اور بی اے کا امتحان اسلامیہ کالج سے پاس کیا تھا۔ فراغت کے بعد چند برس انھوں نے کابل میں بسر کیے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعد وہ لاہور آ گئے۔ فراغت تعلیم کے بعد سے اب تک سارا زمانہ انھوں نے تعلیم وتدریس کے مشاغل میں گزارا تھا۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت کے کاموں کا انھیں خاص شوق تھا۔ بہت اچھے مناظر تھے۔ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ بہت خوبیوں کے مالک اور نہایت متقی پرہیزگار بزرگ تھے۔

سیاست سے انھیں دلچسپی تھی۔ اگرچہ ان کے سرگرم رہنے کی خبر

سوانح نگار کی زبان وقلم پر نہیں آئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت مانوس تھے۔ زیادہ وقت ان کی دعوت وارشاد اور تبلیغ واشاعت کے کاموں میں اورعواید ورسوم کے خلاف سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ جمعیت دعوت وتبلیغ کی سرگرمیوں کے تذکرے میں ان کا نام بار بار آیا ہے۔

لاہور میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی اور یہی ان کی سرگرمیوں کا میدان تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا عبداللہ قصوری کی اولاد نرینہ میں ان کے تین بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ عبداللہ ملک نے ان تین بیٹیوں کا ذکر ملتا ہے۔ عبداللہ ملک نے ان تین بیٹیوں ...... بلقیس بیگم، رضیہ بیگم اور رشیدہ بیگم...... کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان کے بیٹوں میں یہ نام آئے ہیں:

① ...... بڑے بیٹے کا نام غلام احمد فاروق تھا۔ وہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔

② ...... دوسرے بیٹے ممتاز احمد خالد تھے۔ وہ کاروبارِ تجارت میں مشغول تھے۔

③ ...... تیسرے بیٹے ابوبکر نامی شعبہ تعلیم سے وابستہ اور زوالوجی کے پروفیسر تھے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں خدمات انجام دیں اور کئی تحقیقی منصوبوں پر کام کیا تھا۔ انھوں نے ہارورڈ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں جب کہ ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی، انتقال ہوا۔

**مولانا عبدالقادر قصوری کی اولاد:**

① ...... مولانا محی الدین احمد، مولانا عبدالقادر قصوری کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ اپریل ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام برکت علی رکھا گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم سے گریجویشن کی تکمیل تک ان کا یہی نام رہا۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ کالج سے انھوں نے بی اے پاس کیا تھا اور ڈگری میں ان کا یہی نام درج ہے۔ لیکن ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا تعارف ہوا اور مولانا ان کے دینی ذوق اور افکار وعقاید سے واقف ہوئے، دونوں کے مابین اعتماد پیدا ہوا اور رشتہ مضبوط ہوا تو مولانا آزاد نے برکت علی ان کا نام بدل کر محی الدین احمد رکھ دیا جو ان کا اپنا نام تھا۔ اور اپنے خاندانی افکار وعقائد سے آزاد ہو کر والد کا رکھا ہوا نام ''غلام محی الدین'' ترک کر کے ''محی الدین احمد'' خود رکھ لیا تھا۔ قصوری صاحب کو اپنا نام دینا اور ان کا قبول کر لینا مولانا آزاد کی شفقت اور قصوری صاحب کی سعادت مندی اور حسن ارادت کی بڑی دلیل ہے۔ اس کے بعد خود انھوں نے اپنا نام برکت علی کبھی استعمال نہیں کیا۔ اور اگر قانون اور ضابطے کی کوئی ضرورت کبھی پیش آ گئی البتہ سی آئی ڈی نے ہر موقع پر ان کا نام محی الدین عرف برکت علی استعمال کیا۔ علمی، دینی اور سیاسی حلقوں میں ان کا نام محی الدین خوب مشہور ہو گیا تھا۔

۱۹۱۲ء میں الہلال کے نکلتے ہی ملک میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ ہمارے ممدوح کا الہلال سے تعلق اس کے اجرا کے وقت ہی سے پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس کی دعوت سے بہت متاثر اور اس کے مؤید تھے۔ الہلال کی زبان، اس کا اسلوب تحریر، اس کے مضامین کی ترتیب وتدوین اس کی پیش کش کے پہلو بھی شائقین کے لیے کشش کا موجب تھے۔ الہلال کے اس پہلو نے انھیں بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اس کی دعوت حق کے سامنے سمع وطاعت کا سر جھکا دیا۔ پھر جب مولانا آزاد نے جماعت حزب اللہ پر مضمون لکھا تھا اور ''من انصاری الی اللہ'' کی دل کو تڑپا دینے والی صدا بلند کی تھی تو وہ اس کے لَبّیر ہو گئے۔ درحقیقت انھوں نے مولانا آزاد کی دعوت حق کے اعلان کے پہلے ہی روز اپنی جان نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی تھی کہ نہ جانے کب اور زندگی کے کس موڑ پر یہ نذرانہ جاں پیش کرنے کی ضرورت پیش آ جائے اور ان کے عزم راسخ کو عمل میں لانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو جائے۔

مولانا محی الدین قصوری نے اپنے ذوق کتاب وسنت اور خدمت ملت کے عزم صادق وراسخ اور گوناگوں خوبیوں کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد کے دل میں اپنے لیے جو جگہ بنا لی تھی اس کا اثر صرف انھی کی ذات تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ خاندان کے بزرگ اور خرد تک منتقل ہو گیا۔ مولانا آزاد اگرچہ ان سے عمر میں صرف ایک سال بڑے تھے اور مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا آزاد میں تو باپ بیٹے کی عمر کا

تفاوت تھا، لیکن خاندان میں مولانا آزاد کا احترام مثل ایک بزرگ کے ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں ہجرت کی بیعت وشوریٰ کے لیے بزرگ باپ اور سعادت مند بیٹا دونوں قصور اور لاہور میں مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے ذوق ومجاز بالاعلان تھے۔ اور مشورے اور عمل واقدام کے فیصلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے قائم مقام تھے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ ان دونوں بزرگوں نے مولانا آزاد کے حق دست حق پرست پر بیعت کی تھی۔ لیکن یہ یقین رکھتا ہوں کہ اس عمل شریف کی ادائیگی کے بغیر اعتماد کا یہ مقام حاصل کر لینا ممکن ہی نہ ہوسکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا محی الدین احمد قصوری پر جو اعتماد تھا، وہ معلوم ہے اور ان کی ذات سے تحریک رجوع الی القرآن کے سلسلے میں بہت توقعات رکھتے تھے۔ مولانا قصوری مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذوق اور خدمت کے شوق سے نوازا تھا۔ اس کا اندازہ ان کے اس مضمون سے بہ خوبی ہوجاتا ہے جو الہلال کی دعوت کی نسبت ''صدائے ملت'' کے زیرعنوان ۱۳/اکتوبر ۱۹۱۲ء کو لاہور میں شائع ہوا تھا۔ یہ درحقیقت ایڈیٹر الہلال کے نام ایک خط ہے، جس کی طرف دعوت الہلال پر تبصرے اس کی اہمیت اور اسلوب تحریر کی دل نشینی کی نسبت سے ایک مقالے کے حدود اور خصوصیات کو چھو لیتی ہے۔ ان کی انھیں خوبیوں کی بنا پر مولانا آزاد ان پر بہت شفقت فرماتے تھے اور انھیں بہ شوق قرآنِ حکیم کے اسرار ورموز کی تعلیم دیتے اور ذوق کی تربیت فرماتے ہیں۔

مولانا محی الدین کو مولانا آزاد سے تعلقات اور ان کی شفقت پر بڑا ناز تھا۔ بعض مواقع پر انھوں نے مولانا آزاد سے بڑے جارحانہ سوالات کیے، لیکن یہ ان کے ناز کی بات تھی۔ مولانا آزاد نے ان کا برا نہیں مانا اور نہایت شفقت کے ساتھ ان کے سوالات کا جواب دیا۔ مولانا قصوری کے نام ان خطوط پر ان کے نوٹس اور مولانا آزاد کے جوابات کے مطالعے سے دونوں بزرگوں کے باہمی روابط محبت واعتماد اور ناز ونیاز کا پتا چل جاتا ہے۔

کلکتے میں مولانا آزاد کے قریب رہ کر تقریباً ایک سال مولانا کی صحبت، دارالارشاد کے دروس میں شرکت اور مولانا آزاد کی نگرانی میں روزنامہ اقدام کے اجرا کے زمانے میں مشورہ وہدایات سے جو فیض اٹھایا تھا، اس کی مثال ان کے ہم مشرب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے سوا کسی اور میں نہیں ملتی۔ اس میں بھی مولانا قصوری مرحوم کو ایک درجہ امتیاز حاصل تھا۔

مولانا محی الدین نے اپنی زندگی میں جو تکالیف اٹھائی تھیں اور جو دکھ جھیلے تھے ان کا سلسلہ صرف انھیں کی ذات تک محدود نہیں رہا، ان کے والد گرامی اور برادر عزیز مولانا محمد علی تک دراز ہوگیا اور سب کو قید ونظر بندی کے دکھ جھیلنے پڑے۔ پولیس کے چھاپوں، انٹیلی جنس کی خانہ متلاشیوں، ذرائع معیشت کے نقصانات، زندگی کے عیش وراحت کے فقدان اور بے شمار مسائل ومصائب نے خاندان کے ہر چھوٹے بڑے کو پریشان کر دیا تھا۔ ان کے اسباب وپس منظر میں مولانا ابوالکلام آزاد سے سیاسی رشتے اور شخصی روابط کا بھی حصہ ہے۔ لیکن ان بزرگوں کی زبان سے کبھی کوئی شکایت کا لفظ نہیں سنا گیا۔ مولانا آزاد سے تعلقات پر ہمیشہ فخر ہی کیا۔ اور نہ ان تعلقات کے اظہار واعتراف میں کبھی حکومت کے جبر وتشدد کے خوف کا دل میں گزر ہوا اور نہ کسی کے طعن وملامت اور نکتہ چینی کی پروا کی۔ مولانا آزاد کے ایک فطری تقریب تعارف میں مکتوب الیہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے ۱۹۱۲ء میں شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ جب کہ الہلال جاری ہوئے چند ہی مہینے ہوئے تھے۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ اس وقت سے لے کر تقسیم ہندوستان تک میں ہمیشہ ان کی مخصوص عنایات کا مدار رہا ہوں۔ جب میں ان سے دور بھی رہا ہوں تو انھوں نے مجھے ہمیشہ محبت آمیز خلوص سے نوازا ہے۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سے اپنے رشتہ وتعلق کا اسی وقت اظہار واعتراف کیا، جب وہ خود رانچی میں جلا وطنی اور نظر بندی کی صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔ مولانا نے ان کی نظر بندی وگرفتاری کی خبر سنی تو

تڑپ اٹھے۔ یہ وقت تھا جب تذکرہ اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ اسی وقت قلم اٹھایا اور کاغذ پر اپنے تاثرات کا ایک دائمی نقش ثبت کردیا۔ یہ نقش ''تذکرہ'' کی آخری اور اڑتیسویں فصل کی صورت میں جگمگا رہا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''یہاں تک لکھ چکا تھا کہ ''ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد بی اے کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کرلیا گیا ہے۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعے کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں:

دردے کیس نامہ می کردم رقم
کان بجر الدمع مخروجاً بہ دم

عزیز موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی وجوش آلامی وایثار للّٰہ وفی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات زندہ کرنے والا ہے اور بالخصوص اس عزیز کے اور صادق اور استعداد کامل ہے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس! فتنہ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں، لیکن دوسروں کو اس میں کیوں کر ایک کیا جاتا ہے؟ بہ ظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے راہ ورسم رکھتے ہیں! سبحان اللہ اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے! جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست ہی نہیں بن سکتا:

اے ہم نفساں! آتشم ازمن بگزیرید
ہر کس کہ شود ہمرہ با دشمن خویش موت!''

[تذکرہ: کلکتہ البلاغ پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۱۹ء، ص: ۳۱۴تا۱۵]

[جاری ہے]



# مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمہ اللہ کی اخلاقی زندگی

شاہد فاروقی ناگی، گوجراں والا

برصغیر پاک وہند ایک ایسا خطہ ہے۔ جہاں بے شمار فتنوں نے اسلام کے خلاف کام کرنے کے لیے سر اٹھایا اور اسی طرح جب بھی کوئی فتنہ اٹھا، اللہ نے اس کا سر قلم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی صالح افراد کی جماعت، کوئی صالح فرد اور کوئی نہ کوئی صالح عنصر بھیج کر اسلام کی حفاظت فرمائی۔ فرعون کے مقابلے کے لیے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا، ابراہیم علیہ السلام کو نمرود کی تکذیب کے لیے اور ابوجہل کے غرور کو توڑنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ یونہی ہر دور میں ہوتا چلا آیا کہ جہاں بھی کفر وشرک، بدعت ورسومات نے سر اٹھایا تو اللہ نے اپنے نیک بندوں کے ذریعے سے اس کی تکذیب کروائی ہے۔

اگر اکبر نے توحید کو گزند پہنچانے کی کوشش کی تو شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ جیسے فرد کو اللہ نے پیدا فرمایا۔ جب بدعات ورسومات سے اسلام کی روح بدلنے لگی تو اللہ نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کو مجدد کی صورت میں بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول کی حدیث کو عام کرنا چاہا تو اللہ نے سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کی صورت میں رحمت فرمائی۔ اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی جیسے ملعون نے جب جھوٹی نبوت کا تاج پہننے کی کوشش کی تو اللہ نے اس کے لیے شیخ الاسلام، فاتح قادیان، امام المناظرین مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمہ اللہ کو پیدا فرمایا۔

یوں تو مولانا کی شخصیت بے شمار اوصاف کا احاطہ کیے ہوئے ہے لیکن ہم اس وقت صرف ان کی زندگی کے ایک پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ کیوں کہ مولانا کی جماعتی زندگی، ان کی علمی، عملی، ملی، قومی زندگی، ان کی مناظرانہ زندگی اور ان کی سیاسی ومذہبی زندگی پر بے شمار اہل علم نے اپنے قلموں سے صفحات تحریر فرمائے ہیں۔

لیکن اس وقت ہم جس پہلو پر روشنی ڈالیں گے وہ ہے مولانا کی اخلاقی زندگی۔

مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمہ اللہ نہایت بلند اخلاق اور اعلیٰ عادات وخصائل کے حامل تھے۔ نرم خو، حلیم الطبع، خوش گفتار، بلند کردار، متواضع، منکسر المزاج، اعتدال پسند اور میانہ رو تھے۔ اسی وجہ سے اپنے اور بیگانوں میں انتہائی عزت وتکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمہ اللہ تخلقوا باخلاق اللہ کی تصویر تھے۔ دوست ودشمن کے ساتھ احسان ومروّت، خلق ومحبت سے پیش آتے اور اس میں کسی قسم کی تخصیص وتفریق روا نہ رکھتے۔ مسلم وغیر مسلم، چھوٹے وبڑے، غریب وامیر اور حامی ومخالف سے آپ کا حسن سلوک یکساں تھا۔ آیئے اب ہم ان کی زندگی کے چند اخلاقی پہلوؤں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

## اساتذہ کا احترام:

مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمہ اللہ شروع ہی سے اپنے اساتذہ کا بہت احترام کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں کہ مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمہ اللہ میرے ساتھ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے۔ اسی لیے بڑے بڑے مباحثوں میں جہاں اکابر دیوبند موجود ہوتے، مباحثہ اس خاکسار (یعنی مولانا) کے سپرد کر دیا جاتا۔ یوں تو مولانا نے بے شمار علماء واساتذہ سے فیض حاصل کیا مگر مولانا محمود الحسن دیوبندی سے آپ کو اور ان کو آپ سے خاص محبت تھی۔ جس کا تذکرہ مولانا نے خود کیا ہے۔

## بچوں سے شفقت، بزرگوں کا احترام:

ایک مرتبہ کوئی ضعیف العمر شخص اپنے بچوں کے ساتھ دفتر ”اہل

حدیث'' آیا بچے کارآمد کاغذوں پر ہاتھ مارنے لگے اور ایک دو کاغذ پھٹ گئے۔ ملازم نے جو بچے کی یہ حرکت دیکھی تو اس کو سخت الفاظ میں جھڑکا۔ بزرگ شخص کو بھی برا بھلا کہا اور کرسی سے اٹھا کر ایک چٹائی پر بٹھا دیا۔ اتنے میں مولانا موصوف تشریف لے آئے اور ان کو ملازم کی اس گستاخی کا پتا چلا تو سخت ڈانٹ پلائی اور فرمایا:

''بیوقوف تو مسلمان ہو کر بچوں کو جھڑکتا اور بڑوں کی بے ادبی کرتا ہے اور اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی وعید سنائی اور خبردار کیا کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ بچوں سے ہمیشہ شفقت کیا کرو۔'' [سیرت ثنائی، ص:۱۷۲]

## غیر مسلموں سے حسن سلوک:

ایک مرتبہ آپ ریل کے سیکنڈ کلاس ڈبے میں بیٹھے تھے کہ ایک سکھ مسافر اپنی جگہ سے اٹھا تو اس کو اوپر کے پھٹے سے ایسی چوٹ آئی کہ وہ چکرا کر گر پڑا اور کراہنے لگا۔ مولانا اس کے پاس پہنچے اس کو اٹھایا، سنبھالا، بستر پر لٹایا، سر اور پاؤں دبائے۔ اس نے ہر چند منع کیا مگر آپ نے فرمایا: ''سردار صاحب! اسلام نے محض مسلمانوں کی خدمت کا حکم نہیں دیا بلکہ تمام بنی نوع انسان اور تمام مذاہب کے پیروؤں سے نیک سلوک کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس لیے میں نے جو سلوک آپ سے کیا ہے یہ کوئی آپ سے احسان نہیں کیا ہے بلکہ یہ میرے فرائض میں داخل ہے۔ [سیرت ثنائی، ص:۱۷۱]

ایک دفعہ امرتسر کا ایک ہندو بیمار ہوا، آپ عیادت کو گئے، اس کو تسلی دی۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں تو آپ نے کچھ رقم اسے بھجوا دی اور ایک عطار سے فرمایا کہ اس لالے کو جس دوا کی ضرورت ہو اسے دے دیا کرو اور قیمت میرے حساب میں لکھ لیا کرو۔ [سیرت ثنائی، ص:۱۷۴]

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن مذاہب کے خلاف حضرت مولانا ساری زندگی بولتے اور لکھتے رہے، مناظرے اور مباحثے کرتے رہے۔ انھیں مذاہب کے لوگ بہ صد عزت و احترام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ غیر مسلم عوام تو درکنار وہ خواص جن کے ساتھ آپ کے ساتھ ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی۔ جلسوں میں جن کے ساتھ مناظرے اور مباحثات کا بازار گرم رہتا تھا، وہ بھی آپ سے ملنے کا شوق رکھے اور آپ کی نیاز حاصل کرنے کو آتے رہتے۔

## مقلدین سے تعلقات اور سلوک:

ایک دفعہ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم نے واقعہ سنایا جو احناف کے بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا ایک مرتبہ سید حبیب بیمار ہو گئے اور کئی دن صاحب فراش رہے۔ وہ مسلکاً بریلوی تھے اور روزنامہ ''سیاست'' کے مالک اور ایڈیٹر تھے، جو لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ سید حبیب فقہی مسلک کے اعتبار سے مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے مخالف تھے اور اخبار میں ان کے ساتھ سلسلہ بحث جاری رہتا تھا۔ مولانا کو ان کی بیماری کا پتا چلا تو عیادت کے لیے لاہور تشریف لائے اور ان کے مکان پر پہنچے۔ مولانا محمد بخش مسلم نے بتایا کہ اس وقت وہ بھی سید حبیب کے پاس موجود تھے۔

مولانا نے چند منٹ مزاج پرسی کی اور ان کے پاس بیٹھے اور پھر ان دونوں حضرات سے نظر بچا کر چپکے سے ایک لفافہ سید حبیب کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ لیکن سید صاحب کو پتا چل گیا اور بات ظاہر ہو گئی۔ سید صاحب نے شکریہ ادا کیا اور لفافہ واپس کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مولانا نے ان کے لیے دعا فرمائی، انھیں تسلی دی اور اصرار کیا کہ وہ لفافہ رکھ لیں۔ سید صاحب نے لفافہ کھولا تو اس میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ یہ تقریباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے اور سو روپے کی رقم اس دور میں بہت بڑی رقم تھی بلکہ سو روپے والے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو عام آدمی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ امرتسر کے ایک مذہبی فرقے کی طرف سے ۳،۲،۱، نومبر ۱۹۳۷ء کو ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس میں بعض مقرروں نے اہل حدیث کے خلاف تقریریں کیں بالخصوص مولانا کا نام لے کر جوش جذبات میں کئی ایسی باتیں کہہ دیں کہ جس سے اشتعال پھیل گیا۔ جلسے کے دوسرے دن ۴ نومبر کو ان الزامات کا جواب دینے کی غرض سے وہاں کی مسجد مبارک میں جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں شرکت و تقریر کے لیے نماز

عصر کے بعد چار بجے کے قریب مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ اپنے پوتے رضاء اللہ اور دیگر حضرات کے ساتھ بذریعہ تانگہ مسجد کو روانہ ہوئے۔ جب تانگہ مسجد مبارک کے قریب پہنچا اور مولانا نے تانگہ سے اتر کر ایک شخص ڈاکٹر محمد اسحاق سے مصافحہ کیا تو اچانک قمر بیگ نامی ایک نوجوان نے تیز دھار (گنڈاسے) سے مولانا پر وار کیا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ عمامہ وکلاہ کٹ گئے اور سر مبارک زخمی ہوگیا اور تیزی سے خون بہنے لگا۔ اتنے میں حملہ آور نے دوسرا وار کیا جوان کے چہرے اور پیشانی پر پڑا۔ مولانا زمین پر گر پڑے پھر فوراً سنبھلے اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ زخموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور تمام جسم اور لباس خون سے سرخ ہوگیا اور اس حالت میں جو پہلا جملہ ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا:

" فزت بربّ الكعبة ۔"

''ربّ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔''

اس کے بعد عربی شعر پڑھا:

هل انت الا اصبع دميت    في سبيل الله ما لقيت

خون کی کثرت دیکھ کر یہ دعا کرتے تھے:

اللهم احشرني في المقتولين ۔

''اے اللہ! قیامت کے دن میرا حشر شہیدوں کے ساتھ کرنا۔''

حملہ آور بھاگ گیا اور پولیس میں رپورٹ درج کر لی گئی۔ آخر کچھ عرصے کے بعد وہ کلکتے سے پکڑا گیا اور ۷ جنوری ۱۹۳۸ء کو پولیس امرتسر لائی۔ مقدمہ چلا اور ۱۶/ اپریل ۱۹۳۸ء کو اسے چار سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ قصہ مختصر کہ مولانا اس کے خلاف مقدمہ کے حق میں نہ تھے مگر چند تنظیموں کی تحریک سے پولیس حرکت میں آئی اور ملزم گرفتار کیا گیا۔

اصل بات جو اس واقعہ میں ہمارے مضمون سے تعلق رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم بڑے ٹھنڈے دل ودماغ کے مالک تھے۔ انتقام کا جذبہ ان کے قلب میں نہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جس شخص نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا اس کے ایام اسیری میں اس کے بیوی بچوں کے لیے پچاس روپے ماہوار خفیہ طور پر اس کے گھر پہنچاتے رہے، کیا اس قسم کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟ اس دنیا میں مختلف مسالک، فقہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار علماء موجود ہیں۔ سیاسی لیڈروں کی بھی کمی نہیں، رفاہِ عامہ میں دلچسپی لینے والے بھی ہر جگہ مل سکتے ہیں۔ لیکن مولانا ثناء اللہ جیسا صاف دل، جرأت مند، سچا آدمی نہیں ملے گا۔ جو قاتلانہ حملہ کرنے والے کے اہل وعیال کی باقاعدہ مدد کرتے رہے۔

قارئین کرام! غور فرمائیں مولانا کی فراخ دلی اور وسعت قلبی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے قاتل تک کی مالی اعانت کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور ہر چند اسے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ حالاں کہ یہ محض ایک وقتی اشتعال تھا جو بعض شر پسندوں کی وجہ سے ہوا۔

لیکن اس مجاہد اعظم کو جب اسلام کے نام پر غیر مسلموں سے مناظرہ کرنے کے لیے دعوت دی جاتی تو وہ یہ پروانہ کرتے کہ دعوت دینے والے کا تعلق کس فرقے سے ہے، دعوت دینے والے وہ تو نہیں جو انھیں کافر کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور ان کے قتل کی منصوبہ بندی کرتے اور اس پر لوگوں کو ابھارتے ہیں بلکہ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لیتے۔ اخلاق وعادات کو اسوۂ حسنہ کی روشنی میں باہمی مخالفت سے بالاتر رکھا۔ ''واعتصموا بحبل الله جميعا'' پر عمل کرنے والے اور کروانے والے تھے، یہی وجہ تھی کہ سخت سے سخت قسم کے اعتراضات کے جوابات بھی مولانا بڑے احسن طریقے سے دیتے۔

**ہم مسلک علماء سے حسن سلوک:**

مولانا کی علمی زندگی کا ایک واقعہ جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ثنائی روپڑی نزاع ہے جو کہ مولانا کی تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن کی اشاعت کے بعد سے شروع ہوا۔ یہ نزاع کیا تھا؟ اس کی کیا وجوہ تھیں؟ اس سے جماعت میں کیوں کر اختلاف پیدا ہوا؟

یہ تفصیل کا محل نہیں کیوں کہ ہمارا موضوع مولانا کی اخلاقیات پر بات کرنا ہے مگر جو بات ہم یہاں پر مولانا کی وسیع الظرفی کی بیان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس نزاع کے آخر میں فیصلہ کی ایک صورت شیخ الحدیث حافظ عبداللہ روپڑی ؒ نے پیش کی، جسے مولانا ثناء اللہ

صاحب نے منظور بھی کیا۔ وہ یہ تھی اگر مولوی ثناء اللہ ؒ صاحب یہ تسلیم کرلیں کہ تفسیر القرآن جو حدیث سے ثابت ہو اور صحابہ نے کی ہو، وہ میری تفسیر سے مقدم ہے تو ہمارا تفسیری نزاع اس سے ختم ہو جائے گا۔

[عبداللہ امرتسری مدیر تنظیم روپڑ، مؤرخہ ۴ ربیع الاوّل ۱۳۵۹ھ]

بجواب رقعہ حافظ عبداللہ روپڑی صاحب

میں حدیث صحیح کی تفسیر اور تفسیر صحابہ کو بتشریح محدثین مقدم جانتا ہوں۔[ثناء اللہ بقلم خود ۴-۴-۱۴]

اب تو بات صاف ہوگئی کہ مولانا نے ہی اس نزاع کو بفضلہٖ تعالیٰ ختم کرنے کی کوشش کی اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اس مقام پر ایک اور واقعہ نقل کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جو کہ مولانا کی اعلیٰ ظرفی کی عکاسی کرتا ہے اور مولانا کا علماء کے بارے احترام کا پتا دیتا ہے۔

یہ مارچ ۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ فیروز پور میں انجمن اہل حدیث کا جلسہ تھا جس میں حافظ عبداللہ روپڑی ؒ بھی تشریف فرما تھے۔ نظموں اور تقاریر کا سلسلہ جاری تھا کہ مولانا محمد علی لکھوی (جو اس جلسہ کے میزبان تھے) مولانا ثناء اللہ ؒ کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ تمام علمائے کرام ان کے احترام میں کھڑے ہوئے اور سب نے باری باری ان سے مصافحہ کیا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ کرسی پر بیٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے ساتھ قطار میں حافظ صاحب تشریف فرما ہیں۔ مولانا نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حافظ صاحب نے ان سے مصافحہ فرمایا۔

## طنز ومزاح:

مولانا یوں تو بڑے شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ تقریر وتحریر اور عام گفتگو میں جذب وکشش پیدا کرنا اور قارئین وسامعین کے لیے دلچسپی پیدا کرنے کا قدرت نے ان میں فن ودیعت کیا ہوا تھا۔ لیکن کسی کی تحقیر وتذلیل کے لیے مذاق اڑاتے تو وہ برا سمجھتے تھے۔ لیکن مناظرات ومباحثات میں جب آپ اپنے مخالفوں پر پھبتیاں کستے۔ تو انھیں آپ کی فی البدیہہ طنز سے بچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ غیر مسلموں کے اعتراضات کا جواب دیتے وقت آپ جس طنز ومزاح کو استعمال فرماتے اس سے مفر ناممکن تھا۔

ایک دفعہ کسی سکھ لیڈر نے آپ سے پوچھا: ''مولانا! بھیڑ اور سور کی شکل وشباہت تقریباً ایک جیسی ہے پھر آپ بھیڑ کیوں کھاتے ہیں اور سور سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی مولانا نے قہقہہ لگایا اور فرمایا: سردار جی آپ نے سوال تو بڑا ٹیڑھا کیا ہے مگر یہ تو کہیے کہ جب آپ بیوی، ماں، بہن، یا بہو، بیٹی میں پوری مشابہت پاتے ہیں تو پھر بیوی کیوں حلال سمجھتے ہیں اور ماں، بہن، یا بہو، بیٹی کو کیوں حرام جانتے ہیں؟ سنیے اسلام نے ہمیں بھیڑ کی حلت اور سور کی حرمت کا حکم دیا ہے۔ لیکن آپ کے مذہب میں یہ سراحت بھی نہیں کہ فلاں کو بیوی بناؤ اور فلاں کو نہ بناؤ سکھ نے جب آپ کا یہ جواب سنا تو ندامت سمیٹتا ہوا چل دیا۔

ایک بار ایک عیسائی نے کہا کہ اگر تمہارے رسول ﷺ، اللہ تعالیٰ کے اتنے مقبول اور محبوب تھے تو اپنے لخت جگر حسین رضی اللہ عنہ کو کربلا میں شہید ہوتے دیکھ کر کیوں اللہ سے سفارش نہ کی اور کیوں اسے بچا نہ لیا؟

مولانا نے بڑی متانت سے فرمایا! بھائی کہا تو تھا مگر اللہ میاں نے جواب دیا کہ میرے حبیب ﷺ میں کیا کروں؟ میں تو خود اس فکر میں ہوں کہ ظالم عیسائیوں نے میرے اکلوتے بیٹے مسیح کو صلیب پر لٹکا دیا اور میں کچھ نہ کرسکا۔ حسین رضی اللہ عنہ تو پھر تیرا نواسہ ہے۔

## صبر واستقامت:

حیات مستعار کے آخری دنوں میں مولانا ثناء اللہ کو ابتلا وآزمائش کی کئی منزلوں سے گزرنا پڑا۔ مگر صبر جمیل کا دامن پکڑنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

مولانا پر قاتلانہ حملہ اور اس کے بعد والے حالات تو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب مولانا کے آخری ایام ہیں اور ان کے صبر وتحمل کی داستان کا ذکر کرتے ہیں جو آج کل کے عوام تو درکنار علماء میں بھی ناپید ہے مولانا نے حقیقتاً العلماء ورثة الانبیاء کی تصویر پیش کی ہے۔ جس طرح اللہ اپنے انبیاء کو نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد ان کو

مختلف آزمائشوں سے گزارتا ہے اوران سے قربانیاں طلب کرتا ہے۔
اسی طرح جوان انبیاء کے مشن کو بڑھانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اللہ ان کو بھی آزمائش میں گزارتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایمان کی پختگی کا پتا دیتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب جب آگ وخون کی لپیٹ میں آیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو دوسرے شہروں اور علاقوں کی طرح امرتسر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ان حالات میں مولانا کے اکلوتے بیٹے مولوی عطاء اللہ اپنی گلی اور محلے کے مسلمانوں کی نگرانی پر متعین تھے اوران کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دیتے تھے۔ رمضان کا آخری عشرہ اوراگست کی تیرہ تاریخ تھی کہ ہندو اور سکھ بلوائیوں کا ایک جتھہ اس گلی کے قریب سے گزرا۔ مولوی عطاء اللہ حسب معمول پہرہ دے رہے تھے۔ کہ کسی نے ایک مکان کی چھت سے دستی بم پھینکا جو مولوی عطاء اللہ کے بالکل قریب آ کر گرا اور گرتے ہی پھٹ گیا۔ مولوی صاحب شدید زخمی ہو گئے زخم اتنے شدید تھے کہ مولوی عطاء اللہ تھوڑی دیر بعد بحالت روزہ جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ بوڑھے باپ کو اس عالم میں اکلوتے بیٹے کی دائمی مفارقت کا جو صدمہ پہنچا ہوگا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

فرزند دلبند کی نماز جنازہ مولانا ثناء اللہ نے خود مسجد میں پڑھائی۔ اس کے بعد ۱۴؍اگست کو اہلیہ محترمہ پوتے پوتیوں اور گھر کے تمام افراد کو ساتھ لے کر امرتسر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان کا شمار امرتسر کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ بہت بڑی جائیداد کے مالک تھے، کتب خانہ نہایت شان دار اور بہت سی نایاب اور عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اسلامیات اور دینیات کے علاوہ دیگر مذاہب سے متعلق کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا لیکن سب کچھ وہیں رہ گیا۔ گھر سے نکلے تو صرف پچاس روپے جیب میں تھے اور معمولی لباس زیب تن تھا۔ انھیں سب سے زیادہ افسوس کتب خانے کا تھا۔ بیٹے کی موت کا افسوس کرنے والوں سے کہتے تھے اسے تو مرنا ہی تھا، مجھ سے پہلے مرتا یا بعد میں اصل المیہ تو یہ ہے کہ کتابیں ضائع ہو گئیں۔

مولانا امرتسر سے لاہور آئے اور چند روز وہاں مقیم رہے، جلد مولانا اسماعیل سلفی رحمہ اللہ صاحب اور گوجراں والا کے چند معزز حضرات انھیں گوجراں والا لے آئے۔ یہاں سکونت کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق اچھے خاصے مکان کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ مکان جامع اہل حدیث (جامعہ محمدیہ چوک نیائیں) کے قریب تھا۔ مولانا شدید صدموں کی زد میں تھے، چلنا پھرنا مشکل تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے۔ مصائب وآلام کے بے پناہ ہجوم کے باوجود چہرے کی بشاشت اور زبان کی شگفتگی بحال تھی۔ بعض لوگ انھیں مسجد میں کچھ روپے پیسے دیتے تھے کسی نے پانچ روپے دیئے۔ کسی نے دس روپے دیئے یا اس سے کم یا زیادہ جو کچھ کوئی دیتا لے لیتے لیکن جیب میں نہیں ڈالتے تھے ہاتھ میں پکڑے رکھتے اور کسی امرتسری کو جسے وہ مستحق امداد سمجھتے آواز دیتے اور رقم اسے دے دیتے۔ مولانا کے لیے یہ سخت ترین ابتلاء کا وقت تھا لیکن اس وقت بھی انھوں نے فی سبیل اللہ قسم کا کوئی پیسہ نہیں لیا۔

چنیوٹ کی جماعت اہل حدیث نے زکوٰۃ کا ہزار یا پانچ سو روپیہ جمع کر کے آپ کی خدمت میں بھیجا آپ نے رقم دیکھی تو فرمایا صاحب! کیا کہوں! نقصان بے اندازہ ہوا ہے اور تکلیف بھی بہت زیادہ ہے۔ مگر غیرت گوارا نہیں کرتی کہ زکوٰۃ لے کر کھاؤں یہ کہہ کر روپے واپس کر دیئے اور تنگی سے وقت گزارنا گوارا کر لیا اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے رہے اور اسی سے مانگتے رہے۔

گوجراں والا میں تھوڑا ہی عرصہ رہے اسی اثنا میں ان کے نام سرگودھا میں ایک پریس الاٹ ہوا اور مکان بھی مل گیا۔ چناں چہ وسط جنوری ۱۹۴۸ء میں وہ سرگودھا تشریف لے گئے۔ پریس کا نام وہی ثنائی برقی پریس رکھا اور اس کا انتظام اپنے پوتے مولوی رضاء اللہ کے سپرد کیا۔ سرگودھا جانے سے تقریباً ایک ماہ بعد ۱۳؍جنوری ۱۹۴۸ء کو داہنے پہلو پر فالج کا حملہ ہوا جس سے سماعت، بصارت، شناخت اور گویائی کی قوتیں ختم ہو گئیں۔ بہت علاج کروائے جس کے نتیجہ میں تھوڑا بہت پہچاننے لگے۔

لیکن اس سفر کا وقت قریب تھا جس پر بڑے بڑے جلیل القدر انبیاء واولیاء رواں دواں ہوئے۔ چناں چہ کل نفس ذائقة الموت کے

قانون کے مطابق ۱۵/ مارچ ۱۹۴۸ءکو رئیس المناظرین، امام المتکلمین، قاطع شرک وبدعت وخرافات، مبلغ اسلام، فاتح قادیان، شیخ الاسلام اس دارِ فانی کو الوداع کہہ کر ہم سے رخصت ہوگئے۔ اس طرح اسلام دشمن طاقتوں کو خاک میں ملانے کے لیے جدوجہد کرنے والا وہ اللہ کا سپاہی، قانونِ فطرت کے مطابق اپنے خالق حقیقی کی خدمت میں جا پہنچا اور یوں حاضر جوابی کا عظیم باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔

**اللھم اغفرلہ وارحمہ .**

❀❀............❀............❀❀

# استاذ قاری سعید احمد بن محمد بن عیسیٰ کی یاد میں

(مولانا) افتخار احمد تاج الدین الازہری

قاری سعید احمد بن محمد رحمہ اللہ موجودہ سال کے شروع ہوتے یعنی دوجنوری ۲۰۰۹ء بروز جمعۃ المبارک علی الصبح وفات پا گئے۔

**انا للہ وانا الیہ راجعون**

مرحوم صوبہ سندھ کے عظیم قاریٔ قرآن، عالم باعمل، مسلک حق اہل حدیث کے مبلغ گوشہ نشین اور کم گو عالم دین تھے۔

قاری صاحب ۱۹۴۶ء کو شہر شکار پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والدمحترم مولانا محمد صاحب المدنی کے مدرسہ عربیہ دارالقرآن والحدیث میں حاصل کی۔ یہ مدرسہ میہڑ میں انھوں نے ۱۹۲۶ء میں قائم فرمایا تھا۔ قاری سعید احمد صاحب کے والد گرامی نے انھیں سب سے پہلے قرآنِ کریم حفظ کروایا اور بعد میں تجوید وقرأت کی تعلیم اسی مدرسے کے اساتذہ سے دلوائی۔ ازاں بعد اس مدرسہ میں وہ تجوید وقراءت کے استاذ مقرر ہوگئے۔ آپ قرآنِ کریم کے غلط تلفظ کو برداشت نہ کرتے تھے۔ انھوں نے تجوید وقراءت کی بڑی خدمت کی اور بہت سے طلباء کی تربیت فرمائی۔

قاری سعید احمد صاحب اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ اسلامیہ (مدینہ یونیورسٹی) سعودی عرب بھی گئے۔ وہاں معروف وجید اساتذہ سے علم دین حاصل کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قاری صاحب کا خاندان حنفی المشرب تھا۔ ۱۹۸۰ء کو سعودی عرب سے مراجعت ہوئی تو آپ عامل بالحدیث یعنی اہل حدیث مسلک سے وابستہ ہوگئے۔ اس طرح انھیں اپنے عزیز واقارب کی مخالفت بھی برداشت کرنا پڑی۔ آپ نے کئی مساجد ومدارس میں قرآنِ کریم کی تعلیم سے طلباء کو مستفید فرمایا۔ وہ کچھ عرصہ جامعہ بحرالعلوم السّلفیہ میرپورخاص میں بھی پڑھاتے رہے۔ انھوں نے ایک سال کے قلیل عرصے میں ۲۰ طلباء کو تیار کیا یعنی قاریٔ قرآن بنا دیا۔ یقیناً یہ ان کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا، ان شاء اللہ۔

قاری لکھنے لکھانے کا شوق بھی رکھتے تھے۔ ہمارے مجلّہ 'بحرالعلوم' میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ قاری صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے چار بچے دو بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دوسری بیوی سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

قاری صاحب شوگر کے مرض میں ایک عرصے سے مبتلا تھے۔ ۲۳ دسمبر ۲۰۰۸ء کو میہڑ شہر سندھ میں سیرت النبی ﷺ کانفرنس کی صدارت فرما رہے تھے کہ ان کی طبیعت خراب ہونا شروع ہوگئی۔ لاڑکانہ ہسپتال میں داخل کرایا گیا مگر کچھ دن زیر علاج رہنے کے بعد ہسپتال میں وفات پا گئے۔

ان کی نماز جنازہ شاہ بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ کے پوتے جناب ابوحمید شاہ راشدی نے پڑھائی۔ سینکڑوں احباب جنازے میں شریک ہوئے۔ یوں تجوید وقراءت وسنت نبوی ﷺ کا طالب سندھ کی سرزمین میں غروب ہوگیا۔ خدا رحمت کندایں بندہ پاک باز

# سوزِ ناتمام

ہو جو احساس تو پتی بھی ہے تلوار کی دھار
چشمِ بینا ہو تو ذرّہ بھی ہے روشن قندیل

امتیں فتنۂ تہذیب سے ہوتی ہیں تباہ
اس میں بابل کے مکیں ہوں کہ بنی اسرائیل

اس سے جنگل کے درندوں کی ہے وحشت اچھی
عصرِ حاضر نے تراشی ہے جو تہذیب جمیل

زندگی نام ہے بس جذبۂ آزادی کا
یہ وہ نکتہ ہے کہ جس کی نہیں ممکن تحلیل

روحِ فرعون کو ہے ضربِ کلیمی کی تلاش
منتظر آج بھی ہے معجزۂ رَودِ نیل

[ماہرالقادری]